XI-3
1992
جولائی

ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دُودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ـــــــــ ستمبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲

...RMED SHERIFF
25... MARAPPA THOTA,
M. R. PALYAM, BANGALORE

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۱ شمارہ ۳

جولائی ـــــــــــ ستمبر ۱۹۹۲ء

محرّم ـــــــــــ ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان سے ـــــــــــ ۴۵ روپئے

پاکستان سے ـــــــــــ ۱۰۰ روپئے

دیگر ممالک سے ـــــــــــ ۲۰ ڈالر

فی شمارہ ـــــــــــ ۱۲ روپئے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے نازیہ پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

غذا - انسان کی ایک بنیادی ضرورت — مولانا سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

صہیونی سازش اور عالم اسلام — ڈاکٹر محمود حسن — ۲۶

ہندوستان میں علماء محدثین کی دینی خدمات — مولانا غازی عزیر — ۵۵

بحث ونظر

نسخ فی القرآن کا مسئلہ — مولانا ابراہیم عادل — ۷۸

تراجم واقتباسات

مسئلۂ قیاس میں ابن عبدالبر کا موقف — تحریر: استاد عبدالقادر عافیہ
ترجمہ: محمد اسلام عمری — ۱۰۸

نقد واستدراک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت — پروفیسر سید محمد سلیم — ۱۱۶

تعارف وتبصرہ

احسن البیان فی علوم القرآن — منور حسین فلاحی — ۱۱۷

اس شمارہ کے لکھنے والے

(۱) ڈاکٹر محمود حسن ——————
۷۹ - چوتھا نظام پورہ - بھیونڈی

(۲) مولانا غازی عزیر ——————
الخبر۔ سعودی عرب

(۳) مولانا ابراہیم عادل ——————
میرٹھ

(۴) محمد اسلام عمری ——————
ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

(۵) پروفیسر سید محمد سلیم ——————
ڈائرکٹر ادارہ تعلیمی تحقیق - لاہور

(۶) منور حسین فلاحی ——————
ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

(۷) سید جلال الدین عمری ——————
سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حروفِ اغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غذا

انسان کی ایک بنیادی ضرورت

سید جلال الدین عمری

غذا انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی مادّی ضروریات میں اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وہ روزِ اول سے اس کا محتاج رہا، اب بھی اس کا حاجت مند ہے اور آیندہ بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانِ اول حضرت آدمؑ اور ان کے جوڑے حضرت حوا کو پیدا کیا، انھیں جنت میں رکھا، انھیں غذا کی ضرورت تھی ان کی یہ ضرورت پوری کی گئی، وہ بغیر کسی روک ٹوک کے جنت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے، انھیں اجازت تھی کہ جہاں چاہیں رہیں اور جو چاہیں کھائیں۔ اس بھرپور آزادی کے ساتھ صرف ایک درخت ایسا تھا جس سے دور رہنے کی انھیں ہدایت کی گئی تھی۔ یہی پابندی انھیں جنت میں قیام کا حق دار بنا رہی تھی اور اسی میں ان کا امتحان بھی تھا۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ	ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا	بیوی جنت میں رہو اور دونوں وہاں
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا	خوب کھاؤ جہاں سے تمہارا جی چاہے۔
هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ	لیکن اس درخت کے قریب نہ جاؤ
الظَّالِمِينَ ۝[1] (البقرہ: ۳۵)	ورنہ تم ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

اس جنت کے بارے میں حضرت آدمؑ سے مزید کہا گیا۔

---

[1] یہی آیت معمولی فرق کے ساتھ سورۂ اعراف میں بھی ہے۔ الاعراف: ۱۹

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا	بے شک تمہیں اس میں یہ آسائش
وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا	حاصل ہے کہ اس میں نہ بھوکے رہتے ہو
فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝	اور نہ ننگے اور نہ تمہیں پیاس پریشان کرتی
(طٰہٰ: ۱۱۸-۱۱۹)	ہے اور نہ دھوپ۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غذا، لباس اور مکان انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ حضرت آدمؑ اپنی بیوی حواؑ کے ساتھ جنت میں تھے تو اس کا بخوبی اور بہ سہولت انتظام تھا۔ اس کے لیے انھیں محنت مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لیکن شیطان ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ اس کے فریب میں آگئے۔ ہزار نعمتوں کے باوجود شجرِ ممنوعہ کے قریب ہوئے، اسے چکھا، شاید لذیذ تھا اس لیے کھا بھی لیا۔ نتیجہ بڑا بھیانک سامنے آیا، جنت کا استحقاق کھو دیا، ساری آسائشیں اور راحتیں چھن گئیں، جنت سے نکالے گئے اور زمین پر اتار دیے گئے۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ	کہا اترجاؤ (یہاں سے) تم ایک
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي	دوسرے کے دشمن ہو اور زمین میں
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ	ایک وقت تک تمہارا ٹھکانا اور
اِلٰى حِيْنٍ ۝ قَالَ فِيْهَا	سامان زیست ہے اور فرمایا اسی میں
تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ	تم زندہ رہو گے، اسی میں مرو گے اور
مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ (الاعراف: ۲۴-۲۵)	اسی سے تم نکالے جاؤ گے۔

اس طرح زمین آدم وحوا کا مستقر بنی اور ان کی موت وحیات اس سے وابستہ ہوگئی کہ وہ اپنی زندگی کے دن اسی زمین پر گزاریں گے، مرنے کے بعد اسی میں جگہ پائیں گے اور قیامت کے روز اسی سے اٹھیں گے۔ حضرت آدمؑ کو یوں ہی زمین پر چھوڑ نہیں دیا گیا کہ وہ سزا بھگتتے رہیں بلکہ ان کے ذریعہ یہاں ایک نئی دنیا آباد کی گئی اس کے لیے زمین کو نیا رنگ وروپ دیا گیا اور اسے ان کے قیام کے قابل بنایا گیا، اس میں ان کی زیست کا سامان تھا اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا انتظام تھا۔

یہ ہے نسل انسانی کا آغاز اور زمین پر اس کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام۔ پھر

نسل انسانی پھیلی اور زمین کے ہر خطہ میں آباد ہوئی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس طرح زمین کو غذا کے ذخیروں سے بھر دیا ہے قرآن مجید بار بار اس کا ذکر کرتا ہے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کے احسان کا اعتراف اور اس کا شکر ادا کرتا رہے۔ سورۂ انعام میں انسان کی تخلیق کے ذکر کے بعد اس کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(الانعام: ۹۹)

اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے ہر طرح کی نباتات اگائی۔ اس سے سرسبز کھیتی پیدا کی پھر اس سے ہم نے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں، اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ پیدا کیے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان کے پھل لانے اور ان کے پکنے کی کیفیت ذرا دیکھو۔ یقیناً ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔

سورۂ عبس میں انسان کی ناشکری اور ناسپاسی کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

(عبس: ۲۴-۳۲)

انسان ذرا اپنے کھانے پر غور کرے۔ ہم نے اوپر سے خوب پانی برسایا، پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا، پھر اس سے اگائے غلے، انگور اور ترکاری زیتون اور کھجور اور گھنے باغات اور میوہ اور چارہ (اس میں) متاع زیست ہے تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔

ان آیات میں ہر طرح کی نباتات، غلہ اور اناج، تیل، ترکاری، کھجور، انگور اور انار کا ذکر ہے ان ہی چیزوں سے انسان کی بیشتر غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ دودھ، گوشت، خوردنی تیل اور پھلوں کا ذکر بعض اور آیات میں بھی ملتا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً	ہم نے آسمان سے پانی ایک خاص
بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ	مقدار میں اتارا۔ پھر اسے زمین میں ٹھہرایا،
وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝	ہم اس کے غائب کرنے پر بھی قادر ہیں۔
فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ	ہم نے اسی پانی سے تمہارے لیے کھجور
نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَّكُمْ فِيْهَا	اور انگور کے باغات پیدا کیے۔ تمہارے
فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝	لیے ان باغوں میں بہت سے پھل ہیں۔
وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ	ان میں سے تم کھاتے ہو اور وہ درخت
طُوْرِ سَيْنَاءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ	بھی ہم نے پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ۝ وَ	ہے تیل بھی لیے ہوئے اگتا ہے اور کھانے
اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ	والوں کے لیے سالن بھی۔ اور تمہارے
لَعِبْرَةً نُّسْقِيْكُمْ	لیے مویشیوں میں عبرت اور نصیحت ہے
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ	ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے
فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ	ہم تمہارے لیے پینے کی چیز (دودھ)
وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝	نکالتے ہیں۔ تمہارے لیے ان میں اور
(المومنون: ۱۹-۲۱)	بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ان میں سے
	بعض کو تم کھاتے ہو۔

جانوروں کے ذریعہ انسانوں کے لیے دودھ کا اور شہد کی مکھیوں کے ذریعہ شہد کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے انتظام فرمایا ہے اور اس میں اس کی جو کاریگری ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ	بے شک تمہارے لیے مویشیوں
لَعِبْرَةً نُّسْقِيْكُمْ مِّمَّا	میں عبرت کا سامان ہے، ان کے
فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ	پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے اس کے

وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

(النحل: ۶۶-۶۹)

درمیان میں سے ہم تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔ اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم نشہ آور چیز بھی بناتے ہو اور عمدہ کھانے کی چیزیں بھی۔ بے شک اس میں عقل رکھنے والوں کے لیے بڑی دلیل ہے اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی بھیجی کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں پر چھتے بنالے پھر ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کے ہموار راستہ پر چلتی رہ۔ اس کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز (شہد) نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا اور تندرستی ہے بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں میٹھے پانی کے بھی اور کھاری پانی کے بھی ذخیرے رکھے ہیں۔ ان میں صرف میٹھا پانی پینے کے کام آتا اور پیاس بجھاتا ہے۔ لیکن تر و تازہ مچھلی دونوں طرح کے پانی سے ملتی ہے اور قیمتی زیورات بھی ان سے نکلتے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ

دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک تو میٹھا ہے، پیاس بجھاتا ہے اس کا پینا خوش گوار ہے، دوسرا سخت کھاری اور تلخ (لیکن) دونوں طرح کے پانی سے تم تر و تازہ گوشت

حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ	کھاتے ہو اور پہننے کے لیے زیور نکالتے
فِيْهِ مَوَاخِرَ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ	ہو۔ تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ پانی کا
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝	سینہ چیرتی چلی جاتی ہیں۔ تاکہ تم اس کا فضل
(فاطر: ۱۲)	تلاش کرو اور شکر ادا کرو۔

قرآن مجید کی اور بہت سی آیات میں اس طرح کی تفصیلات ہمیں ملتی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر انسان کی ان تمام ضروریات کا انتظام کر دیا جن کا اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے، اس کی کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کی تکمیل کا یہاں سامان موجود نہ ہو۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ	ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار دیا اور
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ	تمہارے لیے اس میں سامان زندگی
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (الاعراف)	پیدا کیا۔ مگر تم لوگ کم ہی شکر کرتے ہو۔

ایک دوسری جگہ یہی بات کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا	ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں
وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا	بھاری پہاڑ رکھ دئے اور ہر طرح
رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا	کی نباتات اس میں ایک مقدار میں
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ وَ	اگائی ہے اور تمہارے لیے اس میں
جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ	معاش کے سامان رکھ دئے اور
وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝	ان بہت سی مخلوقات کی بھی (معاش
وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا	رکھ دی) جن کے تم رازق نہیں ہو۔ کوئی
خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا	چیز ایسی نہیں ہے جس کے ہمارے
بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۱۹، ۲۱)	پاس خزانے نہ ہوں۔ اور ہم ایک
	متعین مقدار میں اسے اتارتے رہتے ہیں۔

ان آیات میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر معاش کا بھرپور سامان کیا ہے، جس سے انسان کی بھی اور دوسری مخلوقات کی بھی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ بہت سی مخلوقات انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں

وہ ان کا رازق نہیں ہے بلکہ اللہ انھیں روزی پہونچاتا ہے۔ معاش کا یہ سامان خدا کی بے پناہ مخلوق کے استعمال سے ختم نہیں ہونے والا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں البتہ وہ جس وقت دینا چاہتا ہے اور جسے جتنا دینا چاہتا ہے دیتا ہے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے خزانے ختم ہو گئے اور اب اس کی مخلوق کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ دنیا جب تک ہے اس کا نظم جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی معاش کا نظم اس طرح نہیں کیا ہے کہ وہ غیب سے اس کے پاس خود بخود پہونچتا چلا جائے بلکہ اس کے لیے اسے جدوجہد اور تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور زمین میں چھپے ہوئے رزق کے خزانوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق اس انداز سے کی ہے کہ آدمی دوڑ دھوپ بھی کر سکے اور اسے آرام بھی ملتا رہے۔ آرام کے بغیر مسلسل جدوجہد اس کے لیے ناممکن اور اس کی جسمانی ساخت کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ	اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا	تمہارے لیے رات اور دن بنائے
فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ	تاکہ تم (رات میں) آرام کرو اور (دن میں)
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝	اس کا فضل (روزی) تلاش کرو تاکہ
(القصص: ۷۳)	تم اس کا شکر ادا کرو۔

نماز جمعہ کے آداب بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ جب اذان ہو جائے تو کاروبار بند کر کے مسجد میں حاضر ہو جاؤ اور خطبہ اور نماز میں شریک رہو۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا	پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین
فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ	میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش
(الجمعہ: ۱۰)	کرو۔

حج کے ذیل میں فرمایا:۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ	اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم حج

تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ	کے دوران میں اللہ کا فضل (بھی)
(البقرہ:۱۹۸)	تلاش کرو۔

رزق کی تلاش میں تگ و دو اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کے سفر کی قرآن مجید صرف یہی نہیں کہ اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ	وہی ہے جس نے تمہارے لیے
الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا	زمین کو تابع کر رکھا ہے کہ تم اس کے
فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ	کندھوں پر چلو اور کھاؤ اس کا رزق۔ اسی
وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝ (الملک:۱۵)	کے پاس تمہیں زندہ ہو کر جانا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ نماز تہجد فرض نہیں ہے۔ اگر فرض ہو تو بڑی دقت پیش آئے گی۔ اس کا ایک سبب یہ بیان ہوا:۔

وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی	اور کچھ لوگ زمین میں اللہ کے فضل
الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (المزمل:۲۰)	(روزی) کی تلاش میں سفر کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے زمین اور آسمان مسخر کر دیے ہیں، بحر و بر اس کے زیر تابع ہیں۔ وہ چاہے تو خشکی اور تری دونوں میں اپنی معاشی جدوجہد جاری رکھ سکتا ہے اور آسمان کی کھلی فضاؤں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ	اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے
الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ	لیے مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں
بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ	اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝	کرو اور اس کے شکر گزار بنے رہو اور
وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ	اس نے تمہارے لیے اپنی طرف سے
وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ	مسخر کر دیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں میں
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ	ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ بے شک اس
یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے
(الجاثیہ:۱۲-۱۳)	جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

سمندر کے سفر اور اس کے معاشی فوائد کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اتنے بڑے سمندر کا مسخر ہونا، اس پر انسان کا سفر کرنا، ساز و سامان سے لدے ہوئے جہازوں اور کشتیوں کا سطح آب پر تیرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اس پر قابو پالے۔ اگر وہ عقل و بصیرت سے کام لے تو اس میں قدرت کی بڑی نشانیاں اسے نظر آئیں گی۔

.... وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي	.... اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں
الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ	چلتی ہیں ان چیزوں کو لے کر جو لوگوں
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝	کو نفع دیتی ہیں ..... بڑی نشانیاں ہیں
(البقرہ:۱۶۴)	عقل والوں کے لیے۔

اس معاملہ میں اسلام کا نقطہ نظر بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہ یہ کائنات انسان کے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں اس کی زیست کا نوع بہ نوع سامان اور ہر طرح کے اسباب معاش موجود ہیں۔ وہ انھیں تلاش کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔

اسلام ایک اور حقیقت ہمارے سامنے لاتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے۔ وہ ایک برتر اور اعلیٰ مخلوق ہے۔ اس کے اور حیوان کے درمیان جو بہت سے فرق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پاک غذائیں عطا کی ہیں، جب کہ دوسری مخلوقات پاک اور ناپاک کے فرق کے بغیر اپنی بھوک پیاس بجھاتی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں انسان کے عز و شرف کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَ	ہم نے بنو آدم کو عزت دی، انھیں
حَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	خشکی اور سمندر میں سواریاں عطا کیں
وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ	اور صاف ستھری اور پاکیزہ چیزوں کی
وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ	روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات
خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝ (بنی اسرائیل:۷۰)	پر انھیں نمایاں فضیلت بخشی۔[1]

---

[1] دنیا کی ہر مخلوق سے انسان کی برتری بالکل واضح ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور ہماری تفسیر کی کتابوں میں اس پر بڑی بحثیں ہیں۔ وہ یہ کہ کیا انسان ملائکہ سے بھی افضل اور برتر ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ملائکہ انسانوں سے افضل ہیں۔ صحابۂ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہی رائے بتائی جاتی ہے۔ (ترجمہ)

سورۂ غافر میں ارشاد ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ	اللہ ہی ہے جس نے تمہارے
الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً	لیے زمین کو جائے قرار اور آسمان کو
وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ	چھت بنایا، تمہاری صورت بنائی
وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ	اور بہت ہی عمدہ صورت بنائی - اور
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ	تمہیں صاف ستھری اور عمدہ چیزیں کھانے
اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	کو دیں - یہ اللہ تمہارا رب ہے پس بڑی

= نے اسے ترجیح دی ہے۔ بعض حضرات ملائکہ پر انسانوں کی فضیلت کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں بعض روایات بھی پیش کی جاتی ہیں لیکن سند کے اعتبار سے یہ کچھ زیادہ قوی نہیں ہیں (ابن کثیر: تفسیر ۵/۳) بعض حضرات نے درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے رسول اور اس کے پیغمبر مطلقاً سب سے افضل ہیں۔ پھر فرشتوں میں وہ فرشتے جو پیغام رسانی کا کام انجام دیتے ہیں وہ دوسرے فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ عام فرشتے تمام انسانوں سے افضل ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہ، اکثر شوافع اور اشاعرہ کی رائے ہے۔ انسانوں میں پیغمبروں کے علاوہ خدا ترس اور نیک بندوں کے مقام و مرتبہ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ روح المعانی: جزء ۱۵/۱۱۸-۱۲۰

زمخشری ان لوگوں میں سے ہیں جو انسانوں پر ملائکہ کی افضلیت کے قائل ہیں۔ انھوں نے مخالف نقطۂ نظر پر سخت جرح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے 'جمیع' کا نہیں 'کثیر' کا لفظ استعمال کیا ہے مطلب یہ کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ انسان کو تمام مخلوقات پر بلکہ یہ کہا کہ بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ 'کثیر' کا لفظ 'جمیع' کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اس لیے اس سے اس بات کی تردید نہیں ہوتی ہے کہ انسان سب سے افضل ہے۔ پھر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ اللہ کی مخلوق میں نبو آدم کے علاوہ دوسرے مخلوقات کی کثرت ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان کثیر مخلوقات پر ہم نے بنو آدم کو فضیلت دی تو اس کے صاف معنی یہی ہوئے کہ سب پر فضیلت دی (الکشاف مع حاشیہ ابن المنیر: ۲/۵۸۴) علامہ آلوسی کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جو فضیلت زیر بحث ہے اس کا تعلق تقویٰ اور نیکی سے ہے۔ آیت میں یہ بحث نہیں ہے اس میں تو ان احسانات کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان پر بہ حیثیت نوع کے کیے ہیں۔ اس میں برے بھلے سب ہی آجاتے ہیں۔ روح المعانی: ۱۵/۱۱۸

(غافر: ۶۴) برکت والی ہے اللہ کی ذات جو رب العالمین ہے۔

مطلب یہ کہ رب العالمین کے انسان پر بے شمار احسانات ہیں، زمین اس کے لیے جائے قرار ہے، وہ یہاں سکون کے ساتھ رہ سکتا ہے یہ نیلگوں، آسمان اس کے لیے چھت کا کام دے رہا ہے۔ وہ نیچے اور اوپر دونوں طرف سے محفوظ ہے۔ اللہ نے اس کی بہترین صورت گری کی ہے، یہ حسین شکل وصورت اور یہ عمدہ قد و قامت کسی کو نہیں عطا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی غذا کے لیے عمدہ چیزیں پیدا کی ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ کے احسانات کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی
اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ	جنس سے بیویاں پیدا کیں اور تمہاری
مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً	بیویوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کیے
وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ	اور تمہیں صاف ستھری اور عمدہ چیزیں
اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ	کھانے کے لیے عطا کیں تو کیا یہ لوگ
اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ	باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسانات
(النحل: ۷۲)	کا انکار کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ کے دو احسانات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے بیوی بچوں اور خاندان کی دولت، جس کی وجہ سے انسان بہت ہی پاکیزہ رشتوں اور ناطوں میں بندھا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف ہمدرد افراد کا ایسا حلقہ ہے جو اس کے دکھ سکھ اور رنج وراحت میں شریک ہے۔ دوسرا احسان ہے پاکیزہ روزی۔ یہ دونوں چیزیں کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہیں۔

ان آیات میں 'طیبات' یا پاک غذاؤں کا جو بار بار ذکر ہے اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اپنی غذائی ضروریات صاف ستھری اور پاک چیزوں سے پوری کرتا ہے۔ ناپاک، گندی، گلی سڑی اور بدبودار چیزیں اس کی غذا میں شامل نہیں ہیں، جب کہ بہت سی دوسری مخلوقات ان ہی میں سانس لیتی ہیں اور ان ہی

سے غذا حاصل کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو چیزیں اس کی غذا میں شامل ہیں ان کے بھی صاف ستھرے، نرم وملائم اور نفیس اجزا وہ استعمال کرتا ہے۔ دانہ وہ کھاتا ہے، بھوسی اور چوکر، مویشیوں اور جانوروں کو کھلاتا ہے، پھل وہ کھاتا ہے اور بیشتر پھلوں کے چھلکے خدا کی دوسری مخلوقات کے کام آتے ہیں۔ مچھلی اور بہت سے جانوروں کا گوشت اور ان کے عمدہ اجزا کو وہ اپنی غذا میں شامل کرتا ہے اور ان کے گندے اجزا دوسرے جانوروں کی خوراک بن جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ غذا کو پکاکر اور ایک غذا کو دوسری غذا کے ساتھ ملاکر اپنے لیے قابل ہضم، زیادہ مفید، لذیذ اور ذائقہ دار بناتا ہے۔ یہ امتیاز اور خصوصیت کسی اور ذی روح مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ ہمارے قدیم علماء نے بھی اس کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

طیبات کی اس بحث کے شروع میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نقل ہوئی ہے۔ اس کے ذیل میں علامہ قرطبی کہتے ہیں۔

طیبات سے مراد لذیذ ماکولات اور مشروبات ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ گھی، شہد، مکھن، کھجور، حلوٰی (جیسی چیزیں اس میں آتی ہیں) جب کہ دوسری مخلوقات کی روزی بھوسی اور ہڈی جیسی چیزوں میں رکھی گئی ہے[1]

امام رازی فرماتے ہیں:-

انسان اپنی غذا حیوانوں سے بھی حاصل کرتا ہے اور نباتات سے بھی۔ اس میں غلہ اور اس نوعیت کی سب چیزیں آجاتی ہیں۔ ان میں جو بہترین چیزیں ہیں انھیں صاف کرکے، پکاکر اور لذیذ بناکر وہ استعمال کرتا ہے۔ یہ بات سوائے انسان کے کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہے[2]

علامہ ابن کثیر نے انسان کی تکریم اور اس کی غذا کے متعلق جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم سے نوازا، اسے بہترین ساخت عطا کی، وہ پیروں سے بالکل سیدھا چلتا ہے، غذا ہاتھ سے کھاتا ہے، جب کہ جانور

---

[1] قرطبی: الجامع لاحکام القرآن: ۱۰/۱۹۱

[2] رازی: التفسیر الکبیر: ۵/۴۳۳

چار پیروں سے چلتے اور براہِ راست موٗنھ سے کھاتے ہیں، اسے سمع و بصر اور عقل و فہم کی ایسی قوت ملی ہے کہ وہ چیزوں کے درمیان فرق کرتا، دنیا اور آخرت میں ان کے نفع و نقصان اور ان کے اثرات و نتائج سے باخبر ہوتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی سواری کے لیے خشکی میں جانوروں سے اور سمندر میں کشتیوں اور جہازوں سے کام لیتا ہے، اس کی غذا میں طرح طرح کے کھانے ۔۔غلہ، پھل گوشت اور دودھ جیسی چیزیں شامل ہیں۔ وہ عمدہ مناظر سے استفادہ کرتا اور بیش قیمت ملبوسات پہنتا ہے۔ یہ سب چیزیں آدمی خود بھی تیار کرتا ہے اور دوسرے مقامات سے بھی اس کے پاس پہونچتی ہیں[1]

ان آیات میں 'طیبات' عمدہ اور نفیس غذاؤں کو کہا گیا ہے۔ یہ لفظ حلال چیزوں کے لیے بھی آیا ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'خبائث' ہے۔ قرآن مجید نے حرام چیزوں کو اسی سے تعبیر کیا ہے۔ حلال چیزوں کے استعمال کی وہ پوری اجازت دیتا ہے، البتہ حرام چیزوں سے صراحتًا منع کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وصفِ خاص یہ بیان ہوا ہے:

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ — وہ ان کے لیے پاک چیزیں حلال
يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف ۱۵۷) — کرتا اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔

غذا کے بارے میں مختلف رویّے اختیار کیے جاتے رہے ہیں۔ ایک یہ کہ جس چیز سے پیٹ بھر جائے، جسم کو تازگی اور توانائی حاصل ہو، کام و دہن کو لذت ملے اور جو نفس کو مرغوب ہو آدمی اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھائے، خوب کھائے پیئے اور عیش کرے۔ اس میں جائز و ناجائز کا فرق کرنا ایک بارِ گراں ہے۔ انسان کی خواہشات اور ضرورتیں اس کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ مذہب کی پیدا کردہ حلال و حرام کی ساری بحثیں بے معنیٰ ہیں۔ یہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے۔ اس میں انسان اپنے نفس اور خواہش کی اتباع کرتا ہے۔ اس سے برتر کسی قاعدہ اور ضابطہ کو تسلیم نہیں کرتا قرآن مجید کے الفاظ میں یہ رویہ انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ اس لیے کہ حیوان بھی

---

[1] ابن کثیر: تفسیر ۳/۵۱

اس سے آگے نہیں سوچتا۔ وہ کہتا ہے :

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ	جن لوگوں نے اللہ کا انکار کیا وہ
وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ	دنیا سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس
وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝	طرح کھا رہے ہیں جس طرح جانور
(محمد : ۱۲)	کھاتے ہیں۔ جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

دوسرا رویہ یہ ہے کہ حلال وحرام کا تعین خود سے کرکے اسے خدا کی طرف منسوب کردیا جائے۔ یہ حرکت ان افراد اور قوموں کی طرف سے ہوتی ہے جو اصولی طور پر دین اور مذہب کو تو مانتے ہیں لیکن ان کے پاس دین کی صحیح تعلیمات نہیں ہوتیں وہ مختلف اوہام وخرافات اور فاسد تصورات کے تحت حلال وحرام کی فہرست خود سے وضع کرتے رہتے ہیں اور اسے اپنے خود ساختہ دین کا جزء بناتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی اور بہت سی قوموں کی طرح عرب کے مشرکین بھی اس غلطی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ قرآن مجید نے ان سے اس کی دلیل طلب کی۔ اس نے کہا حلال وحرام کا تعین کرنا خدا کا کام ہے۔ اس کی ذمہ داری تم نے کب سے لے لی؟ یہ مقام تمہیں کب سے حاصل ہوگیا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے بارے میں فیصلہ کرو کہ ان میں سے کس کا استعمال جائز ہے اور کس کا ناجائز۔ کون حلال ہے اور کون حرام؟ ارشاد ہوا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	ان سے کہو کہ کیا تم نے اس پر غور کیا
لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ	ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جو رزق اتارا
حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ	اس میں سے کسی چیز کو تم نے حرام اور
لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝	کسی کو حلال ٹھہرا لیا۔ ان سے پوچھو
(یونس : ۵۹)	کیا اللہ نے اس کی تمہیں اجازت
	دی یا اللہ پر افتراء کر رہے ہو۔

اسی ذیل میں ایک اور جگہ فرمایا :۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ	اور نہ کہو تم، جو جھوٹ تمہاری
اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا	زبانیں بولتی ہیں کہ یہ حلال اور یہ حرام
حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا	ہے تاکہ اسی طرح تم اللہ پر بہتان باندھو۔

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (النحل: ۱۱۶-۱۱۷)

جو لوگ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ تھوڑا سا فائدہ ہے (جو اس سے وہ حاصل کر رہے ہیں بالآخر) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[1]

تیسرا رویہ رہبانیت کا ہے۔ اس میں آدمی روح کی جلا اور اس کی ترقی کے لیے مادی تقاضوں سے صرف نظر کرنا اور انھیں دبانا اور پامال کرنا ضروری سمجھ بیٹھتا ہے، حلال اور پاک چیزوں کا دروازہ بھی اپنے اوپر بند کر لیتا ہے، مباحات بھی اس کے لیے ممنوعات بن جاتی ہیں۔ اس طرح وہ غیر ضروری بندشوں میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنے نفس پر بے جا تشدد اور ناروا سختی کرنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ تقویٰ، خدا ترسی اور روحانی ترقی کے غلط تصور کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے پیغمبروں کا اسوہ اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ تقویٰ اور طہارت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کی روحانی بلندی کو کوئی دوسرا پا نہیں سکتا۔ انھیں اللہ کی طرف سے جو تعلیم دی گئی اور جس کے وہ پابند رہے وہ یہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (المومنون: ۵۱)

اے رسولو! صاف ستھری چیزیں کھاؤ اور صالح عمل کرو۔ بے شک میں جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بارے میں انسان کے اس منفی رویہ کو قرآن مجید سراسر غلط قرار دیتا اور کہتا ہے کہ پاک چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ بھی شیطان کا ایک حربہ ہے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال اور طیّب قرار دیا ہے انھیں انسان حرام سمجھ لے اور اسے اللہ کی طرف منسوب کرنے لگے ارشاد ہے:۔

---

[1] مشرکین عرب کی خود ساختہ حرمت وحلت کی مزید تفصیل سورۂ انعام میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آیت ۱۳۶ تا ۱۴۴۔

MFO SHED
[illegible] PPA THOTA
[illegible] BANGALORE

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۶۸-۱۶۹)

اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔ شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور فحش کا اور اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم وہ باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

مزید ارشاد ہے:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (الاعراف: ۳۲)

ان سے پوچھو وہ زینت جو اللہ نے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے کی پاک چیزیں کس نے حرام کی ہیں کہو دنیا کی زندگی میں یہ اہلِ ایمان کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو ان ہی کے لیے خاص ہوں گی۔ اس طرح ہم جاننے والوں کے لیے آیات کی تفصیل کرتے ہیں۔

بعض صحابہ کرام نے تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر یہ بات سمجھی کہ طیبات اور حلال چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے۔ قرآن مجید نے اس کی اصلاح کی اور فرمایا:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ

اے ایمان والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ ٹھہرالو اور حد سے نہ بڑھو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے تمہیں جو حلال و طیب رزق دیا ہے

اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ (المائدہ: ۸۷-۸۸)	وہ کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو[1]

اس طرح اسلام نے غذا کے بے قید استعمال پر تنقید کی، اس بات سے بھی منع کیا کہ آدمی خود سے اس کے حدود و قیود وضع کرے اور حلال و حرام کا فیصلہ کرے، اس نے اس تصور پر بھی ضرب لگائی کہ پاک چیزوں سے اجتناب نیکی اور تقویٰ کی علامت ہے۔

غذا کے استعمال سے متعلق غلط رویوں پر تنقید کے ساتھ اس نے اس بارے میں صحیح رویہ بھی متعین کیا ہے۔ اس ذیل میں ہمیں اس کی حسب ذیل ہدایات ملتی ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔ سوائے اضطرار اور مجبوری کے ان سے کبھی فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اضطرار میں ضرورت کی حد تک ان کے استعمال کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔ جہاں اضطرار نہ ہو وہاں ان کے استعمال پر اس کی طرف سے گرفت اور باز پرس ہوگی۔ ارشاد ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النحل: ۱۱۵)	اللہ نے تو بس یہ چیزیں تم پر حرام کی ہیں۔ مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوا ہو۔ پس (اس کے باوجود) جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر یہ چیزیں کھالے، بشرطیکہ وہ اس سے لذت کا طالب نہ ہو اور حد سے آگے نہ بڑھے تو (اللہ معاف کر دے گا) بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔[2]

---

[1] امام ابن جریر طبری نے آیت ۸۷ کے ذیل میں جن صحابہ کرام کے اندر اس طرح کا رجحان ابھرا تھا ان کا اور ان سے متعلق واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تفسیر طبری جدید ایڈیشن ۱۰/۵۱۲-۵۲۳ ان میں سے بعض واقعات حدیث کی کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔

[2] یہ آیت مکی ہے۔ سورۂ بقرہ جو مدنی ہے، اس میں بھی یہ آیت (۱۷۳) معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ سورۂ مائدہ (آیت ۳) میں اس کی مزید کچھ تفصیل ہے۔

کھانے پینے کی جو چیزیں حرام ہیں اس آیت میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض اور چیزوں کی حرمت بھی قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ یہ تعداد میں بہت تھوڑی ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام ماکولات ومشروبات حلال اور طیب ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے۔ انسان اپنی عمر، صحت، ضرورت، مزاج اور جغرافیائی اور معاشرتی حالات وظروف کے تحت ان کے استعمال اور عدم استعمال کا خود فیصلہ کرسکتا ہے۔ حرام وحلال کا اصول ایک خاص پس منظر میں اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا	آخر تم اس جانور کا گوشت کیوں
مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ	نہ کھاؤ جسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا
وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا	گیا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل
حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ	سے ان چیزوں کو بیان کردیا ہے جو
إِلَيْهِ وَإِنَّ كَثِيرًا	اس نے تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، حالت
لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ	اضطرار میں ان کا استعمال بھی جائز ہے۔
عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ	بے شک بہت سے لوگ بغیر علم کے
بِالْمُعْتَدِينَ ۝	اپنی خواہشات کو لے کر لوگوں کو گمراہ
(الانعام: ۱۱۹)	کرتے رہتے ہیں۔ بے شک تمہارا رب
	زیادتی کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

مطلب یہ کہ جو محرمات ہیں انھیں تفصیل سے بیان کردیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی ساری چیزیں حلال اور طیب ہیں۔ ان کو بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی حلال چیز کو حرام اور اللہ کی عطا کردہ وسعت کو تنگی میں تبدیل کردے۔ یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش اور ان کے ساتھ بڑی ظلم وزیادتی ہوگی۔

۲۔ اسلام کھانے پینے میں اسراف سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا	کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝	بے شک اللہ اسراف کرنے والوں
(الاعراف: ۳۱)	کو پسند نہیں کرتا۔

اسراف کے کئی پہلو ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کھانے پینے میں حدود شریعت کا پابند نہ رہے اور حلال و حرام کے فرق کے بغیر پوری آزادی کے ساتھ پیٹ کے تقاضے پورے کرتا چلا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کھانے پینے پر بے تحاشا دولت اور مادی وسائل صرف کیے جائیں، ہر وقت دسترخوان کو زیادہ سے زیادہ آراستہ کرنے کی فکر سوار رہے۔ جیسے زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہو۔ صرف کھانے پینے کی لذت مقصود حیات بن جائے۔ اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی حد سے زیادہ مقدار میں کھائے۔ خوراک کا بڑھانا روح کی کثافت کا باعث ہے اور اس سے جسمانی صحت بھی برباد ہوتی ہے۔

۳۔ غذا پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اللہ نے اس کے لیے اسے طرح طرح کی لذیذ غذاؤں سے نوازا ہے۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ اللہ کے اس فضل و احسان پر انسان کو اس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو،
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا	کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تمہیں دی
لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝	ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی
(البقرہ: ۱۷۲)	عبادت کرتے ہو۔

یہی بات سورۂ نحل میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا	پس اللہ نے جو حلال اور پاک چیزیں
طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ	تمہیں دی ہیں انھیں کھاؤ اور اللہ کا
كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝	شکر ادا کرتے رہو اگر تم اسی کی عبادت
(النحل: ۱۱۴)	کرتے ہو۔

اس سے بڑی ناسپاسی اور احسان فراموشی اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی نوع بہ نوع نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوجود انسان اس کا اعتراف نہ کرے اور شکر نہ ادا کرے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ	اور مردہ زمین ان کے لیے ایک
اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا	نشانی ہے۔ ہم نے (بارش کے ذریعہ)
حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا	اسے زندہ کیا اور اس سے اناج پیدا

فِيهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (یٰسٓ ۳۴-۳۵)

کیا جسے وہ کھاتے ہیں۔ اس میں ہم نے کھجور اور انگور کے باغات پیدا کیے اور چشمے اس میں نکالے تاکہ وہ ان کے پھل کھائیں۔ ان کے ہاتھوں نے یہ نہیں بنائے ہیں پھر وہ شکر کیوں نہیں کرتے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (ابراہیم: ۳۴)

اور اللہ نے تمہیں وہ سب کچھ دیا جو تم نے (تمہاری فطرت نے) اس سے طلب کیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔ بے شک انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری انسان کو اس کی نافرمانی اور بغاوت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے بعد کامیابی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور دنیا اور آخرت تباہ ہو کر رہتی ہے، یہی بات بنو اسرائیل کو سمجھائی گئی تھی۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ (طٰہٰ: ۸۱)

جو صاف ستھری چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں وہ کھاؤ اور اس میں حد سے آگے نہ بڑھو (کہ ناشکری اور بغاوت کی راہ اختیار کرو) ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ پھر گر کر رہا (تباہ ہوا)

۴۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کے پیدا کردہ جن غلوں سے، پھلوں اور میووں سے اور دوسری بے شمار نعمتوں سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، ان میں دوسروں کا بھی حق ہے۔ اس حق کو فراموش نہ کرے۔ ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ

وہی ذات ہے جس نے باغات پیدا کیے۔ ان میں سے (بعض وہ ہیں)

وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

(الانعام: ۱۴۲)

جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور (بعض وہ ہیں) جو ٹٹیوں پر چڑھائے نہیں جاتے۔ کھجور کے درخت اور کھیتی اس نے پیدا کی جن میں کھانے کی چیزیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ اسی نے زیتون اور انگور پیدا کیے جن کے پھل ایک دوسرے کے مشابہ بھی ہیں اور مشابہ نہیں بھی ہیں۔ ان کی پیداوار کھاؤ جب وہ تیار ہو جائے اور ان کی فصل کاٹتے وقت ان کا حق ادا کرو۔ اسراف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں دوسروں کا حق ادا کرنے کے حکم کے ساتھ اسراف کی ممانعت ہے۔ اس لیے کہ جو آدمی اسراف میں مبتلا ہو وہ دوسروں کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

اسلام اور مشکلات حیات

معروف عالم دین اور اسلامی ادیب مولانا ابوالبیان حماد لکھتے ہیں: "کتاب پڑھ کر بے ساختہ غالب کا یہ شعر

میری زبان پر آگیا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کتاب میں موضوع اور مواد کی گہرائی و گیرائی کے علاوہ اس میں زبان و بیان کی جو حلاوت اور ادبیت کی جو شیرینی موجود ہے اس سے بھی میں محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور آپ کے بعض فقرے اور جملے بار بار پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ کتاب اگرچہ مختصر سی ہے لیکن آپ نے اس کتاب کے ذریعہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔ بغیر کسی تکلف کے اس کتاب کو بقامت کہتر و بقیمت بہتر کہا جا سکتا ہے۔"

مولانا سید جلال الدین عمری کی اس اہم کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

صفحات ۸۸ ۔ قیمت ۸ روپئے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی ۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

تحقیق وتنقید

صہیونی سازش اور عالم اسلام

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

"جو بھی ملک ہماری مخالفت پر آمادہ ہونے کی جرأت کرے ہمیں اس کے پڑوسی ملک کو اس سے برسرِ جنگ کر دینا ہوگا لیکن اگر یہ پڑوسی ہمارے خلاف متحد ہو جانے کا موقع پیدا کریں تو ہمیں ان کی مقاومت میں بین الاقوامی جنگ مسلط کر دینی ہوگی"۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس کسی مجذوب کی بڑ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تاریخ عالم کے منظم ترین اور مخفی ترین گروہ کے مخفی نوشتہ سے لیا گیا ہے جو زارِ روس کے پرانے کلیسا (Orthodox Church) کے ایک پادری سرجی نائلس (Surgyei A. Nilus) کو حاصل ہو گئے تھے۔ اس نوشتہ کو "The Protocols of the Learned Elders of Zion" یعنی "نوشتہ ہائے اعظم العلماء صہیونیت" کہا جاتا ہے۔ اس نوشتہ پر دستخط کرنے والوں نے اپنے کو صہیونیت کے تینتیسویں (۳۳) درجہ کے نمائندوں سے تعبیر کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تنظیم فری میسن (Free Mason) تحریک کے اعلیٰ ترین عہدیداروں کی تنظیم ہے جسے ایک بے ضرر سماجی (Social) تنظیم سمجھا جاتا ہے اور جس کی شاخیں پوری دنیا میں بشمول ہندوستان کے قائم ہیں۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موجودہ لادینی ترکی کا معمار اور خلافت اسلامیہ کو منسوخ کرنے والا مصطفیٰ کمال اسی تنظیم کا ایک رکن تھا۔ واضح رہے کہ مصطفیٰ کمال خود مسلمان نہیں بلکہ دوئمی فرقہ سے تعلق رکھنے والا تھا[2] جو بظاہر مسلمان اور اصلاً یہودی ہوا کرتے ہیں۔

---

[1] The Protocols of the Learned Elders of Zion, Chapter VII Paragr. 3

[2] الف لیس از رفیق احمد دلاوری۔ ایوان پبلشرز۔ الہ آباد، صفحہ ۲۸۴۔ ۱۹۸۶ء

فری میسن تحریک خلافتِ فاطمیہ کے "بیت الحکمۃ" ہی کی طرح کی ایک تنظیم ہے۔ بیت الحکمۃ وہی جگہ ہے جہاں حسن بن صباح نے باطنیت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فری میسن ہی کی طرح یہاں بھی ارکان کے رتبہ میں تدریج تھی یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ بیت الحکمۃ کے مدارج کا پانچواں درجہ "ماسون" (Mason) کہلاتا تھا۔[1] ممکن ہے فری میسنوں کو ابتدائی تحریک وہیں سے حاصل ہوئی ہو۔ پروٹوکول کے بزرگوں میں تدریج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا سلسلہ سبائی بیج سے پھوٹے ہوئے درخت ہی کی ایک شاخ ہے۔

ان نوشتوں کی روسی اخباروں میں ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں اشاعت ہو چکی تھی۔ لیکن پروفیسر نائلس نے انھیں ۱۹۰۵ء میں کتابی شکل میں باقاعدہ اس لیے شائع کیا کہ عیسائی دنیا کو اس خطرناک تنظیم کی زہرناکی کا علم ہو جائے۔ اس کا ایک نسخہ ۱۹۰۶ء میں برٹش میوزیم لندن میں موصول ہوا تھا جسے بعد میں وکٹر، ای، مارسڈن (Victor E. Marsden) نے روسی زبان سے انگریزی میں منتقل کیا۔[2] موتمر عالم اسلامی نے اس کا ایک نسخہ محفوظ رکھا تھا جس کی مدد سے آج سے تقریباً بیس سال پہلے سوشل ریفارم کمیٹی کویت (Social Reform Committee, Kuwait) نے اسے شائع کیا اور اب اس کی ایک تازہ اشاعت بھی (غالباً پاکستان سے) عمل میں آئی ہے۔[3]

آج یورپ اور امریکہ کو عیسائیوں کا براعظم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ مردم شماری میں ان کی تعداد غالب ہے۔ لیکن نظر غائر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں یہودیوں کو یہاں بالادستی حاصل ہے۔ مسلمانوں اور عالم اسلام کے تعلق سے آج مغربی دنیا کا جو رویہ ہے۔ اس میں عیسائیوں کی مسلم دشمنی (جسے محاربات

---

[1] History of Assasins. Von Hammer (Germany) Trans by Oswald, Charles wood, Banaras, 1926, Page 74

[2] Preface to the Jewish conspiracy - Kuwait Edition

[3] پروٹوکول کا اردو ترجمہ مولانا شمس نوید عثمانی نے کیا ہے جو مولانا عامر عثمانی مرحوم کے رسالہ "تجلی" دیوبند کی ایک خصوصی اشاعت میں مکمل طور سے شائع ہو چکا ہے۔

صلیبیہ یعنی Crusades نے دو آتشہ کر دیا تھا) کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی اسلام دشمنی بھی شامل ہے۔ عبداللہ بن سبا اور اس کی ذریت نے عالم اسلام میں جو فساد برپا کیا اور جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ لیکن یہ یہودی قوم جسے اپنے وقت کی مسلم حکومتوں کے سوا کبھی کہیں پناہ نہیں ملی ہمیشہ ان کی جڑ کھودنے میں مشغول رہی۔ یہ سلسلہ بجائے گھٹنے کے اور بڑھتا جا رہا ہے۔

ریاستہائے متحدہ کی سپریم کورٹ کے ایک یہودی جج لوئی۔ ڈی۔ برانڈیز (Louis D. Brandeis) نے کہا ہے کہ "اب) سب لوگوں کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم یہودی ایک الگ ممیز قوم ہیں۔ جس کا کہ ہر یہودی خواہ وہ کسی مرزبوم سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی عقیدہ کا حامل ہو لازماً ایک رکن ہے۔"[۱]

موسیٰ ہس (Moses Hess) اپنی کتاب "روم اور یروشلم" (Rome and Jerusalem) میں لکھتا ہے "اور سب پر مستزاد یہ کہ یہودی مذہب یہودی حب الوطنی ہی کا نام ہے۔"[۲]

یہودی دنیا میں جہاں بھی ہے صرف یہودیت کا وفادار ہے۔ ہر حکومت میں یہ فیصلہ کن طاقت رکھتا ہے۔ یورپ کی معیشت، معاشرت، سیاست بلکہ مذہب تک پر اس نے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ حکومتوں کے تعلق سے پروٹوکول کہتا ہے۔

"عوام کی خدمت کے لیے جو منتظمین انھیں میں سے چنے جائیں گے وہ تجربہ کار نہیں ہوں گے اور اس طرح وہ آسانی سے ہمارے ان با صلاحیت اور تعلیم یافتہ مشاورین کے ہاتھوں میں جنھیں بچپن سے دنیوی امور کا انتظام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کٹھ پتلی بن جائیں گے جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہمارے ماہرین خصوصی حکومت کرنے کی ضروری ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔"[۳]

۱۔ The International Jew, By Henry ford I (Abridged Edition) Page 49

۲۔ ایضاً ص ۶۱

۳۔ Protocols. Chapter II, Paragraph 2

اپنی قوت وطاقت کا مظاہرہ پروٹوکول نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہر شخص کو یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ہمارے خلاف کوئی معاہدہ بذاتہٖ غیر مفید ہے۔ ہم حد سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کوئی شخص ہماری دسترس سے باہر نہیں ہے۔ قومیں آپس میں ایک ناقابل ذکر معاہدہ تک بغیر ہماری پوشیدہ (غیر مرئی) دست اندازی کے نہیں کر سکتیں"[۱]

پھر اور آگے چل کر کہا گیا ہے۔

"خدا نے ہمیں عبقریت بخشی ہے۔ ایسی مقدار میں کہ ہم ہر کام کرنے کے اہل ہیں"[۲]

اسی پیراگراف میں اور آگے ہے کہ "تمام حکومتوں کی مشین کے پہیے اس کے انجن کی طاقت سے حرکت میں آتے ہیں۔ جو کہ ہمارے ہاتھوں میں ہے اور حکومت کی مشنری کا یہ انجن دراصل "سونا" ہے۔"[۳]

یہودیوں کی اس صفت کا اعتراف محرم رازِ دروں، برطانیہ کے ایک وزیر اعظم ڈزریلی (Benjamin Disraeli) ۱۸۰۴ء/۱۸۸۱ء نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"تم یورپ میں کوئی عقلی تحریک ایسی نہ پاؤ گے جس میں یہودیوں نے زیادہ (سے زیادہ) حصہ نہ لیا ہو۔"[۴]

جن لوگوں کو یہودی افکار سے دلچسپی ہو وہ اس کے مشہور ناول CONNINGSBY (اولین شائع شدہ ۱۸۴۴ء) میں ایک یہودی کردار SIDONIA کا مطالعہ کریں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ یورپ میں وزرائے اعظم تک بجائے ان حکومتوں کے جن کے وہ سربراہ ہیں، اپنی خفیہ حکومت یعنی "یہودیت" کے وفادار ہیں اور ان کا دم بھرتے ہیں۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اسی لیے فرمایا ہے ؎ فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے یہ اپنے روزِ پیدائش (یعنی جب سے یورپ والوں کا یہاں غلبہ ہوا ہے) سے ہی یہودیوں کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ ہنری فورڈ اول (Henry Ford I) ۱۸۶۳ء/۱۹۴۸ء (مشہور موٹر کمپنی فورڈ کے مالک) نے جنگ عظیم اول کے بعد یہودیوں

۱۔ Protocols, Chap. V, Para 5

۲۔ Protocols, chap V Para. 7 ۳۔ ایضاً

۴۔ مقتبس از The International Jew (Abridged) صـ ۶۱

NAWAZ AHMED SHERIFF
25 M MARAPPA THOTA
R PALYAM

کے اثر ونفوذ اور مارکٹ پران کے کنٹرول اور حکومت کے در وبست پران کے استیلاء کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان اپنی رپورٹ پیش کی تھی۔ اس کا ایک ملخص اڈیشن موتمر عالم اسلامی کراچی نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج نہیں بلکہ شروع ہی سے پورے امریکہ پر یہودیوں ہی کی حکومت ہے۔ نیویارک تو ان کا خصوصی گڑھ ہے۔ لیکن پورے ریاست ہائے متحدہ امریکہ (U.S.A) میں بھی یہ "حکومت درون حکومت" کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کمیٹی نے پروٹوکول کا بھی بغور اور تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں عمومی طور پر اور امریکہ میں خصوصی طور پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ پورے طور پر اس پروٹوکول ہی کے عین مطابق ہے۔ نیویارک کے بارے میں یہ رپورٹ کہتی ہے:

"نیویارک یہودیوں کی آبادی کا دنیا میں بہت بڑا مرکز ہے۔ یہ امریکہ کی تجارتی درآمدات اور برآمدات کا دروازہ ہے۔ جہاں (یہودیوں کے بدست) ٹیکس کی وصولیابی ہوتی ہے اور جہاں خاص طور سے پورے امریکہ کی تجارت ان زر کے مالکوں کو خراج تحسین ادا کرتی ہے۔ اس شہر کی پوری سرزمین یہودیوں کی ملکیت ہے۔"[1]

آگے چل کر رپورٹ کہتی ہے "خود یہودیوں کا نعرہ ہے کہ وہ اپنے اثرات کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ریاستہائے متحدہ (U.S.A) کی بنیاد عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت ہے۔ نیز یہ کہ یہودیوں کی وجہ سے جو افتخار اس ملک کو حاصل ہوا ہے۔ اس کے مناسب اعتراف میں یہاں کی تاریخ پھر سے لکھی جانی چاہیے۔"[2]

امریکہ اور یورپ میں تاریخ لکھی جا چکی ہے اور یہودی سازشوں اور چالبازیوں سے واقف ہونے کے باوجود پوری مغربی دنیا یہودیوں کی پشت پناہی پر مجبور ہے۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کا بالفور اعلان (Balfour declaration) اس کا زندہ ثبوت ہے۔ جب برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ بالفور (Lord Arther James Balfour ۱۸۴۸ء/۱۹۳۰ء) نے عربوں اور دنیا کے تمام مسلمانوں سے کیے گئے وعدوں سے صریح بد دیانتی کا ثبوت دیتے

---

[1] The International Jew Page 12

[2] The International Jew Page 18

ہوئے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن بنانے کا اعلان کیا۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے وہاں کی تجارت، معیشت، ذرائع ابلاغ، شراب خانے، جوئے کے اڈے پالیسی ساز ادارے یہاں تک کہ حکومت خود یہودیت اور صہیونیت کے غلام ہیں[1]۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ امریکہ کا کوئی بھی شہری اسرائیل میں جا کر دوسروں سے جنگ لڑ سکتا ہے۔ حکومت اس فعل میں مانع نہ ہوگی۔

اب یہ بات بھی تحقیق ثابت ہو چکی ہے کہ ۱۹۱۷ء کا بالشویک انقلاب تمام تر یہودی سازشوں اور تخریبی کارروائیوں کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔ روسی پولٹ بیورو (Politbureau) میں نصف سے زیادہ ارکان یہودی رہے ہیں۔ اشتمالیت (Communism) کے اعظم رجال مارکس (Karl marx) ۱۸۱۸ء/۱۸۸۳ء لینن (Vladimir Lenin) ۱۸۷۰ء/۱۹۲۴ء۔ ٹراٹسکی (Leon Trotsky) ۱۸۷۷ء/۱۹۴۰ء وغیرہ یہودی ہی تھے۔ کارل مارکس ہی کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے

صاحب سرمایہ[2] از نسل خلیل[3] یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر ست قلبِ او مومن دماغش کافر ست

نیز یہ بھی

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

پروپیگنڈہ یہودیوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جرمنی میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو گیس چیمبر (Gas chamber) میں ڈال کر ہلاک کر دینے کے پروپیگنڈے اور تشہیر سے صہیونیت سے بہت سے مقاصد حاصل کیے۔ اول تو یہ کہ پورے براعظم ہائے یورپ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کے عوام کی ہمدردیاں اس نے حاصل کر لیں۔ دوسرے جرمنوں کے ضمیر کو اس نے ہمیشہ کے لیے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا جس کا کفارہ تاوان کی صورت میں ادا کرنے کے علاوہ خلیج کی حالیہ جنگ میں بھی اس کی شمولیت ہے۔ تیسرے

---

[1] ملاحظہ ہو مذکورہ کتاب۔ یہ پوری کتاب اس قابل ہے کہ اسے غور و فکر سے پڑھا جائے۔

[2] DAS KAPITAL-1867 ۔ کارل مارکس کی تصنیف اور اشتراکیوں کی بائبل۔

[3] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد یعنی یہودی۔

بالفور اعلامیہ کے مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ (U.N.O.) کے ذریعہ اس نے فلسطین کی تقسیم کرائی[1] اور چوتھے خود یہودیوں نے روس میں انقلاب کے دوران اور مابعد دس کروڑ انسانوں کو اذیت دے کر کیمپوں میں نظر بند کر کے اور سائبیریا (Siberia) میں جلاوطن کر کے جو قتل عام کیا تھا اس پر پردہ ڈال دیا۔ Committee for Truth in History (تاریخی حقائق کی جانچ کرنے والی کمیٹی) نام کی ایک تنظیم نے یہودیوں کے ذریعہ انتہائی بہیمانہ طریقہ سے قتل کیے گئے افراد کی تعداد تقریباً دس کروڑ بتلائی ہے۔ تفصیل یوں ہے۔

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر	۴۵,۰۰۰,۰۰۰
یورپ (مشرقی یورپ کا روسی حصہ)	۳,۶۰۰,۰۰۰
ایشیا (روسی حصہ)	۴۶,۲۰۰,۰۰۰
	۹۴,۸۰۰,۰۰۰

یہ کمیٹی The Myth of Six Million (ساٹھ لاکھ کا افسانہ)[2] کے عنوان سے ایک کتاب شائع کر چکی ہے اور اب اس کی دوسری رپورٹ کا پہلا حصہ The Six million Reconsidered (ساٹھ لاکھ پر نظر ثانی) کے نام سے سامنے آیا ہے[3]۔ یہودیوں کی زبردست مخالفت اور چیرہ دستیوں کے باوجود اس رپورٹ کا برطانوی ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مصور ۱۲۴ صفحات کی رپورٹ میں ایک درجن عنوانات اور ۱۳۷ حوالوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ یہودیوں کی تاریخ ہمیشہ جھوٹے پروپیگنڈے کی رہین منت رہی ہے لیکن موجودہ صدی میں اس نے جھوٹ بولنے کا ایک تاریخی اور بین الاقوامی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ جرمنی میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل کے افسانہ کو ایسی شہرت اس نے دی ہے کہ یہودیوں کے اجتماعی جرائم پردۂ خفا میں چلے

---

[1] U.N. Revolution No. 181 C II of 29th Nov. 1947

[2] The Six Million Reconsidered, U.K. Edition, 1979, Page 98

[3] Published by Historical Review Press, Chepel Ashoka, Ladbroke, Southam, Works.

گئے ہیں۔ سوویت یونین میں دس کروڑ انسانوں کو جس بیدردی سے انھوں نے قتل کیا ہے۔ مغرب بجائے اس کا نام لینے کے اسے چھپانے پر مجبور ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہودیوں کے اوپر جس قدر ظلم و ستم کا رونا رویا گیا ہے۔ اس سے کئی گنا زیادہ ظلم و ستم خود یہودی ارض فلسطین میں ڈھا رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی پیمانہ پر ان کے ظلم و ستم کا سلسلہ تمام ہی حکومتوں کے زیر سایہ جاری ہے[۱]۔ شیکسپیر (William Shakespare) ۱۵۶۴ء/۱۶۱۶ء کے یہودی کردار شائیلاک (Shylock) نے یہودی لالچ اور اذیت پسندی کو مثل کر دیا ہے[۲]۔ ہیلیری بیلک (Hillaire Belloc) ۱۸۷۰ء/۱۹۵۳ء[۳] جی۔ کے چسٹرٹن (G.K. Chesterton) ۱۸۷۴ء/۱۹۳۶ء[۴] اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. Eliot) ۱۸۸۸ء/۱۹۶۵ء[۵] نے اپنی تصانیف میں یہودیت کا پردہ فاش کیا ہے۔ اس فہرست میں مشہور ادیب، مفکر اور ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw) ۱۸۵۶ء/۱۹۵۰ء کا نام بھی شامل ہے[۶]۔ ولیم گرمسٹاڈ (William Gramsted) نے ANTIZION کے نام سے ایک مجموعہ اقوال مرتب کیا ہے[۷]۔ اس کتاب میں مرتب نے ادبا، شعرا اور دوسرے مفکرین عالم کے افکار کو جمع کیا ہے۔ جنھوں نے یہودیوں اور ان کے خصائل کا تجزیہ کیا ہے اور اس پر ان کے اقوال مضامین اور کتابیں پائی جاتی ہیں۔ مرتب نے اس مجموعہ کو شاہ فیصل مرحوم ۱۹۰۶ء/۱۹۷۵ء کے نام معنون کیا ہے جو عربوں میں سب سے بڑے صہیونیت شناس تھے اور جنھیں مبینہ طور سے عالم یہود اور امریکہ نے ایک سازش کے

---

[۱] مندرجہ بالا کتاب کا ملخص مفہوم۔

[۲] شیکسپیر کا مشہور ڈرامہ Merchant of Venice (وینس کا سوداگر) جس کی نمائش امریکہ کے بہت سے شہروں میں ممنوع ہے۔ بحوالہ International Jew صہ ۱۱۷

[۳] ملاحظہ ہو اس کی تصنیف The Jews

[۴] چسٹرٹن کے یہاں یہودیوں کے تعلق سے بے شمار حوالے ہیں جنھیں اس کی تحریروں میں متفرق طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

[۵] ملاحظہ ہو Bleistein with a cigar اور Burbank with a Baedeker

[۶] ملاحظہ ہو اس کا مشہور ترین ڈرامہ Man and Superman (انسان اور فوق الانسان)

[۷] Published by the Noontide Press, P.O. Box 1248, Torrance, CA 90505 U.S.A. 1973

تحت شہید کرادیا تھا۔[1] صہیونی عزائم کے شکاروں میں مرحوم ضیاء الحق (پاکستان) بھی شامل ہیں۔ اور ضیاء الرحمٰن مرحوم (بنگلہ دیش) کو بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

یہودیوں کے کردار کی قرآن کریم نے جس انداز میں تصویر کشی کی ہے اس میں تمام انسانوں کے لیے درس عبرت ہے۔[2] قرآن کتاب ہدایت ہے کتاب تاریخ نہیں ہے لیکن قرآن نے یہودیوں کی جو فرد قرار دادِ جرم (Charge Sheet) مرتب کی ہے اس کا تقابل اگر آپ بائبل (Bible) کے عہد نامہ عتیق (Old Testament) اور تلمود (Talmud) سے کریں تو اس کے شواہد مل جائیں گے۔ اناجیل اربعہ (Gospels) میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے کردار کی رونمائی کی ہے۔ اسلامی تاریخ میں جنگ جمل اور جنگِ صفین سے جو سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمانوں کی تفریق اور خصوصیت سے "شیعیت" میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں ان سب میں یہودی ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی نے "تلبیس ابلیس" میں، علامہ عبدالقادر بغدادی نے "الفرق بین الفرق" میں علامہ عبدالکریم شہرستانی نے "الملل والنحل" میں اور علامہ مقریزی نے "الخطط والآثار لمصر" میں ان کی بہت سی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اردو زبان میں جناب رفیق دلاوری صاحب نے ایک نہایت محققانہ اور بیش قیمت تصنیف "ائمہ تلبیس" کے نام سے پیش کی ہے۔[3] حسن بن صباح کی باطنیت (Esotricism) ابوطاہر قرمطی کا الحاد (Atheism) اور بابک خرمی کی اباحیت (Libralism) سب اسی فتنۂ یہودیت کے پروردہ تھے۔

موجودہ دور میں عالم اسلام پر سب سے پہلا حملہ اس دور کے بانیٔ صہیونیت تھیوڈور ہرزل (Theodore Herzl) ۱۸۶۰ء/۱۹۰۴ء نے کیا جب ۱۸۹۷ء میں اس نے ایک وفد کے ساتھ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید ثانی ۱۸۴۲ء/۱۹۱۸ء (مدت خلافت ۱۸۷۶ء/۱۹۰۹ء) سے فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ایک قطعہ زمین خریدنے کی درخواست کی اور اس کے صلہ میں باب عالی کے تمام قرضوں کو ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن سلطان مرحوم

---

[1] جون ۱۹۸۶ء میں نیویارک کے شہریوں سے ان کا خطاب وہاں کے یہودی میئر (Mayor) نے منسوخ کردیا تھا۔

[2] اس موضوع پر اردو زبان میں مولانا عبدالکریم پاریکھ کی مشہور کتاب "قوم یہود اور ہم" ملاحظہ فرمالی جائے۔

[3] شائع کردہ ایوان کمپنی۔ نخاس کہنہ۔ الٰہ آباد۔

نے نہ صرف اس کی درخواست کو نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا بلکہ ہرزل کو بھی ذلیل کر کے اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ یہ بات کہی جاتی ہے کہ ۱۹۰۹ء میں جب سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کیا گیا تو پروانۂ معزولی لے جانے والا وہی وفد تھا جو ۱۸۹۷ء میں ہرزل کے ساتھ گیا تھا۔ مسلمانانِ ہند کو اس بات پر بہت افسوس و ندامت ہے کہ مصطفیٰ کمال جسے انھوں نے غازی اور پاشا کا خطاب دے کر سر آنکھوں پر بٹھایا تھا وہ ازلی اسلام دشمن تھا[1]۔ جس نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو منصبِ خلافت کا خاتمہ کر کے امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھیر دیا ہے[2]۔ تب سے آج تک اس امتِ مرحومہ کا کوئی سیاسی مرکز نہیں ہے۔

یہ وہی زمانہ ہے جب سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے ۱۹۲۵ء میں نجد سے بڑھ کر پورے حجاز پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے انھوں نے ۱۹۰۲ء میں صرف چند درجن لٹھ بند نوجوانوں کی مدد سے ریاض پر قبضہ کیا تھا[3]۔ لیکن اس وقت بقول علامہ اسد (Ex Leopold Weiz) کے "عرب کی روایتی سادگی کو تیل کے سنہرے دھارے نہیں بہالے گئے تھے"[4]۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۶ء میں خلافت کے مسئلہ پر دو کانفرنسیں ہوئی تھیں۔ جن میں سے دوسری الغائے خلافت کے بعد قاہرہ میں ہوئی تھی[5]۔ امید کی جا رہی تھی کہ شاہ عبدالعزیز ابن سعود خلافت کا احیا کریں گے جس کا انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اشارہ بھی دیا تھا۔ لیکن ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو قاہرہ کے ایک تار سے اہل ہند کو اچانک معلوم ہوا کہ ابن سعود نے ملک النجد والحجاز ہونے کا اعلان کر دیا ہے[6]۔ سلطان کے اس فیصلہ میں وہ عظیم وفد بھی کوئی ترمیم نہ کرا سکا جس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم، علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ مولانا احمد سعید مرحوم، علی برادران اور

---

[1] ملاحظہ ہو "ابلیس" از رفیق احمد دلاوری

[2] Encyclopadia Britanica, vol 20, Page 608, also vol. 4, Page 653, 1965

[3] Encyclopadia Britanica, vol. 20 Page 11A, Encyclopadia Americana Vol. 24 Page 305, 1984

[4] Road to Mecca, By Allama Asad

[5] تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء۔ باب ۱۳ Encyclopadia

[6] تحریک خلافت ص ۲۶۲ Britanica, vol 4. Page 653

دیگر لوگ شامل تھے[1] واضح رہے کہ ابن سعود اور شریف مکہ کی اس آویزش میں برطانیہ نے شاہ حسین ابن علی کی امداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن حکومت ہی کے انڈیا آفس (India office) نے مالی امداد ابن سعود کو دی تھی[2]۔ اس سے برطانیہ کی دوغلی پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔

اگرچہ مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ۱۹۲۲ء میں سمرنا (Izmir) کی فتح ترکی کی زبردست کامیابی تھی اور یونانیوں کی شکست میں عیسائیوں کی زبردست ناکامی لیکن ۱۹۲۴ء میں اتاترک کے ہاتھوں الغائے خلافت (Abolition of caliphata) یہودیوں کی اس صدی کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ دوسری کامیابی انھیں اس وقت ہوئی جبکہ ابن سعود جیسے دین دار بادشاہ نے منصب خلافت کا احیا کرنے سے انکار کر دیا۔ فلسطین میں سلطان عبدالحمید سے ایک قطعہ زمین کی یافت میں ناکامی کے بعد یہ ہنگرین نژاد یہودی مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے ۲۷ تا ۲۹ اگست ۱۸۹۷ء میں بیسل (Basle) سوئٹزرلینڈ (Switzerland) میں عالمی یہودی کانفرنس منعقد کی جس میں فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن بنانے کا عہد کیا گیا۔ اس سے قبل ۱۸۹۶ء میں وہ جرمن زبان میں اپنا مشہور رسالہ Jewish state یا Der Juden Staat (یہودی ریاست) شائع کر چکا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے یہودی قومی فنڈ (Jewish National Fund) قائم کیا تاکہ اس سے صہیونیوں کے لیے فلسطین میں زمین خریدی جا سکے[3]۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔

"اگر میں ایک لفظ میں اس کانگریس (۱۸۹۷ء کی بیسل کانگرس) کو بیان کروں، جس کا شائع کرنا مناسب نہ ہوگا۔ تو وہ یہ ہوگا کہ میں نے بیسل میں (یعنی ۱۸۹۷ء ہی میں) یہودی ریاست قائم کر دی ہے۔ اگر میں آج باعلان یہ بات کہہ دوں تو دنیا زور سے ہنسے گی لیکن شاید پانچ برس کے اندر یا زیادہ سے زیادہ پچاس سال کے اندر دنیا دیکھ لے گی کہ یہ بات

---

[1] تحریک خلافت صفحات ۲۶۲ تا ۲۶۴ از قاضی عدیل احمد عباسی۔

[2] Encyclopaedia Americana 1984. Vol, 24, Page 305 and Encyclopaedia Britanica 1985, Vol 20, Page 11A

[3] Encyclopaedia Britanica 1965, Vol. 11, Page 459 نیز Encyclopaedia Americana 1984, Vol. 14, Page 162

سچی ثابت ہوگئی ہے۔"[1]

ایک مصنف کے بقول "اس کی پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی اور وہ اسرائیل میں دوبارہ دفن کیا گیا۔"[2]

اس کی موت ۱۹۰۴ء میں وائنا (Viena) میں ہوئی تھی اور وہ وہیں دفن ہوا تھا۔ لیکن اس کی تدفین ثانی یروشلم میں اس کی خواہش کے مطابق ہوئی تھی۔[3]

یہ ہے فلسطین میں ایک یہودی ریاست کی بنیاد کی تاریخ۔ ابتدا میں تو خود ہرزل کو بھی اس پر اصرار نہیں تھا کہ یہ ریاست فلسطین ہی میں قائم ہو بلکہ ایک موقع پر برطانیہ نے اگانڈا (Uganda) افریقہ (Africa) میں یہودیوں کو جگہ دینا منظور بھی کر لیا تھا لیکن ان لوگوں نے اسے مسترد کر دیا۔ ہرزل نے فلسطین میں جس یہودی ریاست کا نقشہ بنایا تھا اس میں یہودی اور عرب سب کو برابر کے حقوق حاصل رہنے کی بات کہی تھی[4] لیکن بعد کے یہودیوں نے یورپی صلیبیوں کے طرزِ عمل سے جری ہو کر اور پروٹوکول پر عملدرآمد کرتے ہوئے ایسی صورت حال پیدا کی کہ فلسطین کی شکل بدل کر موجودہ نام نہاد اسرائیل کی ہوگئی۔

"پروٹوکول" کی یہودی قومی زندگی میں بڑی اہمیت ہے کیونکہ یہ ان کا خفیہ اجتماعی پلان ہے۔ لیکن یہودیوں نے اسے یہ کہہ کر بالکل جھٹلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیالی افسانہ ہے۔ Encyclopaedia Americane کے سوا Protocols of the Learned Elders of Zion کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اس کا مقالہ نگار جو غالباً خود بھی یہودی ہے۔ اس کے بارے میں لکھتا ہے "ایک الحاقی دستاویز جو یہودیوں اور فری میسنوں سے منسوب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عیسائی معاشرہ برباد ہو جائے گا اور اس طرح ان کے (صہیونیوں کے) زیر اقتدار ایک غیر عیسائی معاشرہ کے قیام کا سبب بنے گا۔ جنگِ عظیم اول کے فوراً بعد اس نے (پروٹوکول نے) بہت زیادہ اعتبار حاصل کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ پردۂ خفا میں چلا

---

[1] Encyclopaedia Americane vol. 14 Page 162

[2] ایضاً

[3] Encyclopaedia Americane vol. 11 Page 459

[4] ایضاً

گیا کیونکہ ۱۹۲۱ء میں لنڈن ٹائمز (London Times)[1] میں فلپ گریو (Philip Grave) نے کچھ اساطیری ذرائع سے اس کی مطابقت ثابت کردی ہے۔"[2]

محققین فورڈ کمیٹی[3] اس دلیل کا جواب پہلے ہی دے چکے تھے۔ لیکن نہ لندن ٹائمز کے مقالہ نگار (Philip Gnave) نے اس کا ذکر کیا نہ ہی Encyclopaedia Americana کے مقالہ نگار نے یہ ان دونوں کی صریح بد دیانتی کی دلیل ہے۔ کمیٹی کی تحقیق یہ تھی کہ "اگر یہ دستاویزات (Protocols) جعلی ہیں جیسا کہ یہودیوں کی طرف سے معذرت پیش کرنے والوں کا موقف ہے تو ان جعل سازوں نے واضح طور سے اسے یہودیوں کی تصنیف ثابت کرنے میں اتنی محنت کی ہے کہ ان کے مخالف سامیت[4] (Anti Sentism) مقصد کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے لیکن (حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود) انھوں نے (پوری دستاویز میں) لفظ "یہودی" کا استعمال فقط دو بار کیا ہے۔ لیکن ان دستاویزات کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ کن لوگوں (عیسائیوں) کے خلاف یہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔"[5]

ہنری فورڈ اول (Henery Ford I) نے جس نے یہ تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی۔ ۱۷ فروری ۱۹۲۱ء کو یہ بیان دیا تھا۔ "ان دستاویزات (Protocols) کے بارے میں میں صرف اتنا کہنا پسند کروں گا کہ یہ حالات حاضرہ پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ دنیا کے حالات ماضی اسی کے مطابق ہیں اور حالات حاضرہ پر بھی یہ مکمل طور سے فٹ ہیں۔"[6]

لیکن ہنری فورڈ کی یہ محنت یہودی پروپیگنڈہ نے بالکل زائل کردی۔ جس طرح انھوں نے پروٹوکول کے نسخوں کو خرید خرید کر ضائع کر دیا تھا[7] اور اس کی اشاعت کو ناممکن

---

[1] یہودی ملکیت کا اخبار

[2] Encyclopaedia Americana, Vol:22 Page 694

[3] اس کمیٹی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

[4] یہ ایک یہودی گالی ہے جس شخص کو یہ اپنا مخالف سمجھتے ہیں اسے فوراً "سامی مخالف" کا خطاب دیدیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہودی اپنا شجرہ نسب حضرت نوح تک ان کے بیٹے سام کے توسط سے بیان کرتے ہیں، ملاحظہ ہو بائبل کتاب پیدائش الباب ۱۰ و ۱۱

[5] The International Jew. Page 75

[6] Introduction to the International Jew - Page 2

[7] Preface to the "Jewish Conspirecy" Kuwait

بنا دیا تھا۔ ویسے ہی ہنری فورڈ کو بھی مجبور کر دیا کہ اس کی اشاعت روک دیں۔ قدرتی طور سے صہیونی حلقوں کی طرف سے زبردست شور و غوغا ہوا اور مسٹر فورڈ کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا گیا۔ آخر کار زبردست دباؤ کی وجہ سے ہنری فورڈ نے کتاب کی اشاعت روک دی یہودی اور ان کے دوست کتب فروشوں کے یہاں پہنچے اور جس قدر بھی نسخے ہاتھ لگے انھوں نے خرید کر ضائع کر دئے۔ کتاب چوروں کو مامور کیا گیا کہ لائبریریوں کو کھنگالیں اور جو نسخہ بھی نظر آئے اسے چرا لائیں۔ اس عمل نے کتاب کو اس قدر نادر اور عسیر الحصول بنا دیا کہ یہ صرف "قدر دانوں کی پسند" بنکر رہ گئی[1]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی فرد قرارداد جرم ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ یہ بھی بتلایا ہے کہ ان کے اوپر نافرمانیوں کی پاداش میں دو مرتبہ تباہی نازل کی گئی[2] ان تباہیوں کا ذکر عہد نامہ عتیق (Old Testament) کی کتاب زبور[3] (Psalms) یسعیاہ[4] (Isaiah) یرمیاہ[5] (Jeremiah) اور حزقی ایل[6] (Ezekiel) نیز عہد نامہ جدید (New Testament) کی کتاب متی[7] (Mathew) اور لوقا[8] (Luke) میں موجود ہے۔ پہلی تباہی جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں ہے ۷۲۱ ق م میں شروع ہوئی اور ۵۸۶ ق م میں بادشاہ بخت نصر (Nebuchad nezzar) ۶۰۵-۵۶۲ ق م کے ذریعہ یروشلم کی بربادی اور یہودیوں کی جلاوطنی پر ختم ہوئی۔ واپسی کا عمل ایران کے شہنشاہ کیخسرو (cyrus) م ۵۲۹ ق م کے فتح بابل یعنی ۵۳۹ ق م میں شروع ہوا اور ۴۴۵ ق م میں نحمیاہ نبی کے زمانہ میں مکمل ہوا۔ دوسری تباہی جس کا ذکر عہد نامہ جدید میں ہے ۷۰ء میں واقع ہوئی جب

---

[1] Introduction to the International Jew - Page I

[2] سورۂ بنی اسرائیل ۴ تا ۷ [3] باب ۱۰۶ : ۳۴ تا ۴۶

[4] ابواب ۱، ۲، ۳، ۸ اور ۳۰ [5] ابواب ۲، ۳، ۵، ۷ اور ۱۵

[6] باب ۲۳ = ۳ تا ۱۶۔ یہاں بائبل کا انداز بیان اتنا فحش ہے کہ اس کو کلام الٰہی ماننا ہی دشوار ہے۔ (اہولہ اور اہولیبہ دو بہنوں کی تمثیلی کہانی)

[7] باب ۲۳ : ۲۴ تا ۲۸ باب ۲۴ : ۲ [8] باب ۲۳ : ۲۸ تا ۳۰

رومی شہنشاہ طیطس (Titus Flavius Sabinus Vespasibnus)
۸۱ء نے یروشلم کو تباہ و برباد کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تمام یہودیوں کو جلا وطن کر دیا۔[1] تب سے یہودی دنیا کے تمام ملکوں میں بکھر گئے ہیں۔ لیکن ان کی بڑی تعداد امریکہ اور یورپ میں ہے۔ جہاں سے وہ اس صدی کی دوسری دہائی سے مسلسل فلسطین میں منتقل ہو رہے ہیں اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو نام نہاد اسرائیل کے قیام کے بعد اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ جون ۶۷ء کی شش روزہ جنگ کے بعد تو یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کے یہودی بھی برابر فلسطین میں آباد ہوتے جا رہے ہیں۔

اس جلا وطنی کو جو اللہ تعالیٰ نے بطور عذاب ان کے اوپر مسلط کیا تھا یہودی ذہن اپنے لیے رحمت قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"خدا نے ہم یعنی اس کے منتخب بندوں کو بطور نعمت ملک بدری عطا فرمائی اور اسی چیز میں جسے کہ تمام دنیا ہماری کمزوری سمجھ رہی ہے ہماری پوری طاقت پوشیدہ ہے جس نے ہمیں آج عالمی حکومت میں اقتدار اعلیٰ کے باب الداخلہ پر لا کھڑا کیا ہے۔"[2]

یہ ہے وہ قوم جسے اللہ نے سبت (سنیچر) کی حرمت توڑنے کے جرم میں بندر اور سور بنا دیا اور ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔[3] جن نے انبیاء تک کو قتل کرنے میں باک نہیں محسوس کیا۔[4] جو حضرت مسیح علیہ السلام کو بزعم خود قتل کر کے اس پر فخر محسوس کرتے رہے۔[5] جنھوں نے نبیوں کی موجودگی میں بھی کھلم کھلا شرک کا ارتکاب کیا۔[6] جن کے اوپر ذلت اور مسکینی طاری کر دی گئی۔[7] اور جنھیں بالیقین پناہ نہیں ملے گی مگر یہ کہ اللہ کی ذمہ داری میں یا انسانوں کی ذمہ داری میں۔[8]

---

[1] مولانا مودودیؒ نے ان تمام چیزوں کی تفصیل پیش فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحات ۵۹۱ تا ۶۱۲۔ مولانا آزادؒ نے بھی تفسیر ترجمان القرآن جلد چہارم (ساہتیہ اکاڈمی اڈیشن) کے صفحہ ۲۵۳-۲۵۴ پر اس طرف بہت مختصر اشارہ کیا ہے۔

[2] Protocol, chap II, Para 8

[3] القرآن، المائدہ: ۶۰

[4] القرآن، النساء: ۱۵۵

[5] القرآن، النساء: ۱۵۷

[6] القرآن، النساء: ۱۵۳

[7] القرآن۔ البقرہ: ۶۱

[8] القرآن، آل عمران: ۱۱۲

مگر یہودی ذہنیت یہ ہے کہ عذاب الٰہی کو بھی دنیوی مفاد کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ یہودیوں نے نہ تو اپنے ان گناہوں سے انکار کیا ہے نہ ہی وہ ان پر شرمسار ہیں۔ بحر مردار کے زلزلہ کو[1] جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر بطور عذاب کے آیا تھا۔ انھوں نے معدنی ذخائر کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ ایسے ہی اس عذاب ملک بدری کو اپنے لیے رحمت سمجھتے ہوئے انھوں نے تمام ممالک میں نفوذ و استیلاء کا ذریعہ بنالیا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو اعلان بالفور (Balfour declaration) ہوا اور ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو مغربی طاقتوں کی آلۂ کار اقوام متحدہ (U.N.O.) نے دو تہائی اکثریت سے فلسطین کی تقسیم کی قرارداد منظور کرلی[2] جس میں ۵۷ فیصد فلسطینی زمین یہودیوں کو اور ۴۳ فیصد زمین عربوں کو دی گئی۔ اس طرح یہودیوں کو اپنے مزعومہ ارض موعود[3] میں لوٹنے کا ایک موقع حاصل ہوگیا۔ اس وقت فلسطین میں یہودی بہت قلیل تعداد میں تھے۔ بقول ایک محقق کے "تیس ہزار فوجی جنھیں جنگ عظیم میں شمولیت کی وجہ سے لڑائی کا تجربہ تھا اس کام میں لگ گئے۔ خفیہ اسلحہ جات کے خزانے جمع کیے گئے۔ اس دوران ہی زیر زمین فوج سبوتاژ اور غیر قانونی تارکین وطن کے جہاز لانے میں مشغول رہی جبکہ مختلف مسلح ٹکڑیاں قتل اور غارتگری میں مصروف رہیں"[4]

"۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو (نام نہاد) اسرائیل نے ایک خود مختار ریاست ہونے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ریاستہائے متحدہ امریکہ اور روس نے فوراً اسے تسلیم کرلیا"[5]

---

[1] ملاحظہ ہو بائبل۔ کتاب پیدائش۔ باب ۱۹۔ آیات ۲۴، ۲۵ نیز القرآن، ہود: ۸۲، ۸۳

[2] Encyclopaedia Americana vol 15, Page 532

[3] اس ارض موعود کی حقیقت قرآن کریم نے یوں بیان کی ہے ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصلحون (الانبیاء: ۱۰۵) "اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے" یہ بات قرآن میں زبور کے حوالہ سے کہی گئی ہے۔ زبور کے مزمور نمبر ۳۷ میں یہ آیتیں آج بھی موجود ہیں لیکن یہود توریت اور زبور کے بجائے تلمود کو زیادہ قابل عمل سمجھتے ہیں جو بائبل کے مقابلہ میں زیادہ گمراہ کن اور الحادی ہے۔

[4] Encyclopaedia Americana Vol. 15, Page 1403

[5] ایضاً ص ۵۳۲

مسلم ممالک میں سے ترکی نے اپنی عرب دشمنی میں اسے تسلیم کرلیا اور انڈونیشیا نے اسلام دشمنی میں۔

اسرائیلی ریاست کا اعلان ہوتے ہی پڑوسی عرب ریاستوں نے یہودیوں کے ساتھ جنگ شروع کردی۔ لیکن اسلحوں کی برتری کی وجہ سے یہودی اپنا رقبہ بڑھاتے ہی رہے عرب ممالک سے ان کی کئی جنگیں ہوئیں ۱۹۵۶ء میں اسرائیل۔ برطانیہ اور فرانس نے مل کر نہر سویز پر قبضہ کرلیا لیکن عالمی رائے عامہ کے دباؤ اور امریکہ کی خواہش پر انھیں خالی کرنا پڑا۔

اسرائیل نے سب سے مہلک حملہ ۱۹۶۷ء میں کیا جبکہ ۵ رجون کو اچانک حملہ کرکے اس نے مصر، اردن، شام اور عراق کی مشترکہ قوت کو پاش پاش کرکے نہ صرف پورے فلسطین بلکہ غازہ پٹی۔ صحرائے سینائی اور گولان کی پہاڑیوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ بقول انسائیکلو پیڈیا امریکانا کے "اسرائیل نے ضرب لگائی اور تاریخ جنگ کے ایک نہایت کامیاب اور زبردست حملہ میں دشمن کی قوتوں کو صرف چھ دنوں میں پارہ پارہ کرکے رکھ دیا"[1]

اقوام متحدہ نے اس وقت اسرائیلی انخلاء کی کئی تجویزیں منظور کیں لیکن اسرائیل نے سب کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ سیکورٹی کونسل کی قراردادوں کو امریکہ مسترد (Veto) کرتا رہا۔ اس وقت ان تجاویز میں بار بار یہی بات کہی جاتی رہی کہ عرب اسرائیل کو تسلیم کریں اور وہ ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ علاقے خالی کردے۔ اس وقت مقبوضہ علاقوں کو غیر مشروط طور سے خالی کرنے کی بات نہیں کہی گئی۔

آج اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۶۷۸ کا بڑا غلغلہ ہے۔ یہ وہی قرارداد ہے جس میں عراق سے غیر مشروط طور پر کویت خالی کردینے کی بات کہی گئی تھی۔ بات تو صحیح ہے لیکن اقوام متحدہ کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ اس کے لیے جنگ اور تباہی کے دہانے کھول دے۔ اگر آج عراق نے اقوام متحدہ کا تقدس مجروح کیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقدس موجود ہی کب تھا؟ یہ تو ۱۹۶۷ء ہی میں اسرائیل امریکہ اور ان کے مغربی حلیفوں کے ہاتھوں پامال

---

[1] Encyclopaedia Americane vol.15 P. 637

ہو چکا تھا۔ جہاں تک اسرائیل کے وجود کا سوال ہے اول تو اقوام متحدہ کو یہ حق ہی حاصل نہیں تھا کہ عربوں کی سرزمین کو بیرونی قزاقوں کے لیے کھول دیتا۔ دوسرے بفرض محال اس کا حق مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ فلسطین کے ۵۷ فیصد حصہ پر یہ حق قائم ہو گا۔ آخر بقیہ مغصوبہ علاقے اسرائیل سے واپس لینے کے لیے اقوام متحدہ نے کیا کیا؟

علامہ اقبال مرحوم نے مجلسِ اقوام (League of Nations) کے بارے میں فرمایا تھا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[1]

موجودہ اقوام متحدہ (United Nations Organisation) بھی ویسی ہی کفن چوروں کی انجمن ہے اور یہاں قبروں کی تقسیم کا بڑا حصہ ان پانچوں کے تصرف میں ہے جنھیں سلامتی کونسل (Security Counail) میں حق استرداد (Veto Power) حاصل ہے۔

سعودی عرب کے شاہ فیصل مرحوم (۱۹۰۶ء/۱۹۷۵ء) نے جون ۱۹۶۷ء میں صدر نکسن کے دورۂ سعودی عربیہ کے موقع پر نہایت دوٹوک الفاظ میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ "مشرقِ وسطیٰ میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ۱۹۶۷ء میں ہتھیائے گئے علاقوں سے اسرائیل کا انخلا نہیں ہوتا اور فلسطینیوں کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل نہیں ہو جاتا۔"[2]

مصر نے ۱۹۷۳ء میں نہر سوئز (Suez Canal) پار کر کے اسرائیل پر ایسا حملہ کیا کہ اس کی فوج تتر بتر ہو گئی اور اس وقت کی وزیر اعظم گولڈا مائر (Golda Mier) کو امریکہ کو S.O.S. (فوری مدد کی درخواست) روانہ کرنی پڑی۔ امریکہ نے فوراً مداخلت کی اور اس کے طیاروں کی مدد سے اسرائیل نے نہر سوئز کو پار کر کے مصری فوج کو محصور کر لیا۔ آخر کار ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء کو امریکی صدر جمی کارٹر (Jimmy Carter) کے زیرِ سایہ صدر سادات (مصر) کو وزیر اعظم بیگن (Menachen Begin) (اسرائیل) سے ایک معاہدۂ امن پر دستخط کرنا پڑا جس کی رو سے مصر کو اسرائیل کو تسلیم کرنا اور اسرائیل کو محرائے سینا سے نکل جانے کے علاوہ اردن کے مغربی کنارہ اور غازہ پٹی کے فلسطینیوں کو حق خود ارادی

---

[1] اس کے علاوہ میں (مجلسِ اقوام کے بارے میں) کچھ نہیں جانتا کہ کچھ کفن چوروں نے (اپنے کام میں سہولت کی خاطر) قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنالی ہے۔"

[2] Encyclopaedia Americana, Vol. 24 Page 307

دینا تھا۔ امریکہ کے دباؤ سے اسرائیل نے ۲۵ اپریل ۱۹۸۲ء کو سینائی کا انخلا تو کر دیا لیکن مغربی کنارہ اور غازہ پٹی کو خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اوائل ۱۹۸۱ء تک ہی وہ ایک لاکھ تیس ہزار فلسطینیوں کے درمیان تیس ہزار یہودیوں کو آباد کر چکا تھا[1]۔ اور اب تو اس نے مغربی کنارہ کو روسی اور اس کے پرانے حلیفوں کے یہاں سے آنے والے یہودیوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ یہودی پلان کے مطابق جلد ہی مغربی کنارہ اور غازہ پٹی میں یہودیوں کی تعداد فلسطینیوں سے بڑھ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب ناانصافیاں اقوام متحدہ کے ناک کے تلے نہیں ہو رہی ہیں۔ اسی اقوام متحدہ کے زیر سایہ اسرائیل نے کیا کیا نہیں کیا؟ آج فلسطینی جہاں کہیں بھی ہیں یہودیوں اور عیسائیوں کی مشترک نفرت کا شکار ہیں صرف اس لیے کہ وہ اپنے وطن لوٹنا چاہتے ہیں جس پر اسرائیل نے قبضہ کر رکھا ہے۔ فلسطین میں آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں اور معصوم بچے فلسطینی مرد، عورت اور بچے اسرائیلی فوج کے درندوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس بربریت کی جانچ کے لیے اگر کبھی کوئی کمیشن ترتیب دیا جاتا ہے تو وہ یہودی بچہ اپنے دانت اور پنجے دکھاتا ہے۔ آخر اقوام متحدہ کو ان پر ترس کیوں نہیں آیا؟ اچانک ان کی انسانیت عرب کے ریگزاروں میں ایرکنڈیشن مکانوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے چند لاکھ امراء کے لیے ہی کیوں جاگ اٹھی ۔ اگر اس دنیا میں عدل اور انصاف نام کی کسی شئے کا وجود باقی ہے تو آخر دنیا کے ڈیڑھ سو ممالک کو کیا ہو گیا ہے؟

آج مشرق وسطیٰ کے کم ممالک باہمی آویزش اور آپسی بے اعتمادی کا شکار ہیں جبکہ اسرائیل ایک زبردست حربی طاقت بن چکا ہے۔ یہ بات بطور خاص نوٹ کی جانے گی کہ سعودی عرب کی سرحد اگرچہ اسرائیل سے نہیں ملتی لیکن نقشہ میں اسے وہی اہم پوزیشن حاصل ہے جو مصر کو ہے۔ ۱۹۶۷ء میں صدر ناصر نے خلیج عقبہ (Gulf of Aqaba) کی ناکہ بندی کر کے بحر قلزم سے اسرائیل کی جہاز رانی مسدود کر دی تھی۔ اگر سعودی عرب چاہے تو وہ بھی عقبہ کی ناکہ بندی کر سکتا ہے کیونکہ خلیج عقبہ کے مغربی کنارے کا اتصال اگر مصر سے ہے تو مشرقی ساحل کا اتصال سعودی عرب سے ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج تک سعودی عرب کو کبھی بھی اسرائیل سے جنگ کرنے کی توفیق نہ ہو سکی۔ عرب

---

[1] Encyclopaedia Americana vol 24, P 307

اسرائیل جنگ کی تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کبھی بھی اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان ایک بھی گولی کا تبادلہ نہیں ہوا۔ پہلی بار سعودی فوج نے عراق کو تباہ کرنے کے لیے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے زیر سایہ جنگ میں حصہ لیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عالم عرب میں سعودی عرب ہی ایسا ملک ہے جو اسرائیل سے حالت جنگ میں نہیں ہے؟ سعودی عرب اور خلیج کی دیگر امارات نے تبلیغ دین کی مساعی میں بیشک قابل قدر حصہ لیا ہے۔ لیکن کیا اس تبلیغ دین سے ثغور اسلامیہ (اسلامی سرحدوں) کی حفاظت کی ذمہ داری ان سے ساقط ہوگئی ہے؟ اور کیا اس تبلیغ اور داد و دہش نے انھیں اللہ کی یہ اجازت دلوادی ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنا والی (تنہا دلی نہیں) اور سرپرست بنالیں؟ پچھلے چالیس سالوں کا سعودی عرب کا تو ریکارڈ یہ بتلا رہا ہے کہ وہ معاذ اللہ اسرائیل ہی کے زیر پناہ زندگی بسر کرنا چاہ رہا ہے ورنہ اسرائیل کے خلاف کسی بھی ممکنہ جنگ کے لیے اس نے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے"[1]

جیسا کہ ہم حوالوں کے ساتھ یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ امریکہ اور یورپ دونوں جگہ عیسائیوں کے لباس میں یہودیوں کی حکومت ہے۔ عیسائیوں کی مسلمانوں سے نفرت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے یہودیوں کو قتل مسیح (علیہ السلام) کے جرم سے بری قرار دیدیا ہے حالانکہ یہودی خود اسے اپنے قابل فخر کارناموں میں سمجھتے ہیں[2] لیکن عالم اسلام کی ساری "مقدس" حکومتیں امریکہ کی نہ صرف حلیف ہیں بلکہ اس کی "چاکری" میں مبتلا ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد شاہ فیصل مرحوم نے امریکہ اور صہیونیت کے خلاف قدرے سخت موقف اپنایا تھا۔ یہ انھیں کا دم خم تھا کہ عربوں نے مغربی دنیا کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا تھا۔

---

[1] وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُونَهُمُ (الانفال ۶۰)

[2] القرآن - النساء - ۱۵۷

اس کے خلاف امریکہ میں مظاہرے ہوئے تھے۔ نیویارک (New York) جو اقوام متحدہ کا ہیڈکوارٹر ہے کے یہودی میئر (Mayor) نے ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والا معمول کا اعزاز منسوخ کر دیا تھا۔ عرب ممالک کی موجودہ غیر معاندانہ پالیسی کا نام "لبرلزم"[1] (Libralism) ہے جس کی یہودی مبلغین (Spokesmen) سب سے زیادہ تعریف کیا کرتے ہیں[2]۔" یہ شکوہ ہنری فورڈ کی مقرر کردہ کمیٹی نے کیا ہے ہمارا تجزیہ اس سے کہیں آگے ہے۔ دراصل جتنے بھی "ازم" (ism) ہیں سب یہودیت ہی کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ خواہ وہ کیپٹلزم[3] (Capitalism) ہو یا فرائڈزم[4] (Freudism) مارکسزم[5] (Marxism) یا یا سوشلزم[6] (Socialism) کمیونزم[7] (Communism) ہو یا لبرلزم (Libralism) نیشنلزم[8] (Nationalism) ہو یا سیکولرزم[9] (Secularism) آج پوری دنیا ان "ازموں" کی شکار ہے۔ لیکن مسلمانوں کو ان تمام "ازموں" نے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ ان کا دین کسی "ازم" کا پیوند نہیں برداشت کر سکتا۔ نیشنلزم کی تحریک نے ترکی کی خلافت اسلامیہ کو شکست دی اور مارکسزم نے تمام مسلمان ممالک کو دو متحارب گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ سیکولرزم نے اور گل کھلائے۔ اس نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے دور اور لاتعلق کر دیا۔ اسلام کی روح ہر جگہ ناپید ہے۔ یہودی سازش مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔

آج عراق اور شام دونوں جگہ بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ اس پارٹی کا بانی مائیکل عفلک نامی ایک عیسائی تھا۔ اس نے عرب قومیت کو اپنی بنیاد بنایا تھا۔ اس کے باوجود عراق اور شام میں ایک دن بھی نہیں بنی۔ ترکی جیسا خلافت اسلامیہ کا گہوارہ سیکولرزم یا لادینیت کا پیرو ہے۔ جو ممالک برائے نام اسلام کے نام لیوا ہیں ان کا کیا ذکر جہاں

---

[1] یعنی آزاد خیالی [2] International Jew Page 31 [3] یعنی سرمایہ داری۔

[4] سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) ۱۸۵۶ء/۱۹۳۹ء مشہور ماہر نفسیات جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانوں کے جملہ امیال و عواطف جنسی جذبہ کے رہین منت ہیں اور خواب تحت الشعور کا مظہر ہے۔ اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں ایک Interpretation of Dreams دوسرے

[5] کارل مارکس (Karl Marx) ۱۸۱۸ء/۱۸۸۳ء جرمن انقلابی جس نے جدلیاتی تاریخ کا نظریہ پیش کیا۔

[6] مارکس کے نظریات کی عملی شکل یعنی اشتراکیت اور اشتمالیت۔

[7] قومیت [8] لادینیت

اسلامی قانون نافذ ہے وہاں بھی روحِ اسلام ناپید ہے۔

نام نہاد اسرائیل میں یہودیوں کا سلوک عیسائیوں سے بھی اچھا نہیں ہے لیکن قرآن کی زبان میں یہ خود ایک دوسرے کے دوست ہیں[1]۔ اور اسلام دشمنی میں دونوں مشترک اسی لیے عیسائی دنیا اسرائیل میں یہودیوں کا شرمناک سلوک برداشت کر لیتی ہے۔

عراق تیل پیدا کرنے والے ممالک پر ہمیشہ زور دیتا رہا کہ تیل کی قیمت بڑھائی جائے لیکن عرب کے شیوخ نے ہمیشہ اہلِ مغرب کی ہوس کا لحاظ کیا۔ ان ممالک کی سب سے بڑی بدقسمتی وہاں کی شخصی حکومتوں کے مصالح ہیں۔ اگرچہ غیر شخصی حکومتوں میں بھی پارٹی کی آمریت ہے۔ لیکن شخصی حکومتوں کی کمزوری یہ ہے کہ ان کے حکمرانوں کے دلوں میں یہ ڈر سمایا رہتا ہے کہ کہیں کوئی انقلاب ان کا خاتمہ نہ کر دے۔ اسی لیے اپنی ذاتی دولت کو یہ یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں رکھتے ہیں۔ ان کا سارا ملکی سرمایہ بھی انھیں ترقی یافتہ اسلام دشمن ملکوں میں تجارتی سرمایہ کاری میں لگا ہوا ہے تاکہ کسی ممکنہ انقلاب کے بعد ان کے عیش و عشرت کا تحفظ ہو سکے۔ اس کے بہت سے نقصانات سامنے آئے ہیں۔ اول تو یہ کہ سعودی ریال اور کویتی دینار اپنے استحکام کے باوجود عالمی زرمبادلہ کا درجہ حاصل نہ کر سکے۔ دوسرے اس دولت اور زرمبادلہ کی وجہ سے امریکہ اور یورپ کی معیشت اور تجارتی منڈیوں کو استحکام حاصل ہوا ہے جبکہ خود ان ممالک کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اس زرمبادلہ اور تجارتی سرمایہ کاری کا سود ہی اتنا زبردست ہوتا ہے کہ صرف اسی سود سے اسرائیل کی پرورش اور نگہداشت ہو رہی ہے اور اس وقت وہ مشرقِ وسطیٰ کے سب سے بڑے اور طاقتور اژدہا کے روپ میں سامنے ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی بھی عرب ملک کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے یہ ممالک عربوں کا سارا تیل کوڑیوں کے مول خریدتے ہیں اور اسی پٹرولیم کی مصنوعات کو انتہائی درندگی سے تمام دنیا اور خود عربوں کو انتہائی گراں قیمت پر سپلائی کرتے ہیں۔ معاشیات (Economics) کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو تبلیغ دین کی مساعی میں ہماری ان "مقدس" حکومتوں کا جو مالی تعاون ہے وہ اسرائیل کے استحکام کے لیے ان کے بالواسطہ مالی تعاون کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ افسوس کہ اس نکتہ پر نہ تو کسی ماہر معاشیات نے غور کیا ہے

[1] المائدہ: ۵۱

نہ ہی کسی شماریاتی (Statistical) ادارہ نے۔

خلیج کی جنگ میں مسلمانوں کا قتل عام اور ایک مسلم طاقت کی بربادی عین یہودی پلان کے مطابق ہے۔ امریکہ اور اس کے یوروپین حلیفوں کا بھی اس سے دہرا مقصد پورا ہو رہا ہے۔ ایک تو خلیج میں بالادستی تاکہ تیل کے ذخائر ان کی دسترس میں رہیں۔ دوسرے اسرائیل کے تحفظ کو یقینی بنانا۔ یہ طاقتیں اسی لیے اسرائیلی جارحیت کو پسپا کرنے کی بات سنتی تک نہیں ہیں کیونکہ یہودیوں کے بین الاقوامی دباؤ کے تحت یہ اسرائیل کی توسیع کی پالیسی میں اسے مدد دینے کے لیے مجبور ہیں۔ نام نہاد اسرائیل نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا ہے کہ اس کی مملکت کی سرحد فرات سے نیل تک ہے۔ عالمی ادارۂ صہیونیت نے عظیم تر اسرائیل کا جو نقشہ شائع کیا ہے وہ کویت کے شائع کردہ پروٹوکول کے نسخہ موسومہ Jewish Conspiracy میں موجود ہے۔ ہم اس کا عکس اس مضمون کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں۔ اس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ یہودی اژدہا مشرق میں عراق شمال میں ترکی کا جنوبی حصہ مغرب میں تقریباً پورا مصر اور جنوب میں مدینہ تک کا علاقہ ہڑپ کرنے کو تیار ہے۔ اسرائیل نے اپنی پارلیمنٹ (Kenne set) کے داخلی دروازہ پر یہ جملہ لکھ رکھا ہے "اے اسرائیل! تمہاری سرحد فرات سے نیل تک ہے"۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہودی قوم تقریباً دو ہزار سال سے اس مسیح موعود کی منتظر ہے جو انھیں غلامی سے آزاد کرائے گا اور تمام دنیا سے یہودیوں کو لاکر فلسطین میں جمع کردے گا۔ افسوس کہ انھوں نے اس مسیح کو جس کے وہ منتظر تھے بزعم خود کبھی کا صلیب پر چڑھا دیا ہے[1] لیکن پروپیگنڈہ کا جادو دیکھئے کہ آج اس "خداوند" کے ماننے والے خود اس کے محافظ بن گئے جس "خداوند" کو تقریباً دو ہزار سال پہلے یہودی خود بزعم خود صلیب پر چڑھا چکے ہیں[2]۔

مجلس اقوام کی جانشین اقوام متحدہ نے ۲۹ نومبر ۱۹۹۰ء کو امریکہ کے دباؤ میں آکر

---

[1] انجیل متی ۲۷: ۳۶، انجیل مرقس ۱۵: ۲۵ انجیل لوقا ۲۳: ۳۳

[2] اللہ نے بتلایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب نہیں دی گئی بلکہ یہ معاملہ مشتبہ کر دیا گیا۔ انھیں تو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا۔ (القرآن، النساء ۱۵۷، ۱۵۸)

عراق کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی تھی[1]۔ یکم دسمبر ۱۹۹۰ء کو عراق نے کویت کے مسئلہ کے ساتھ مسئلہ فلسطین کو جوڑا تھا جسے امریکہ نے مسترد کر دیا۔ آج تک اقوام متحدہ نے کبھی بھی فلسطین کے معاملہ میں اسرائیل پر دباؤ نہیں ڈالا۔ اگر اس کے لیے کسی طرف سے کوئی بھی کوشش ہوئی تو اسے امریکہ نے مسترد (Veto) کر دیا جسے وہاں حق استرداد حاصل ہے۔ واضح رہے کہ گزشتہ دہائیوں میں بہت سی بڑی مچھلیوں نے چھوٹی مچھلیوں کو نگلا ہے، لیکن اقوام متحدہ کو کسی کے خلاف فوج کے استعمال کی اجازت دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس بارے میں تنہا امریکہ کے جرائم کا ریکارڈ یہ ہے۔

۱۔ پنامہ کے صدر ٹورجوس (Torijos) کا قتل۔

۲۔ نہر پنامہ پر بالادستی قائم رکھنے کے لیے پنامہ پر حملہ۔

(۳) چلی (Chile) کی تانبے کی کانوں پر یو ایس کارپوریشن انا کونڈا کی بحالی کے لیے وہاں کے منتخب صدر الندے (Allende) کا قتل۔

(۴) نکاراگوا (Nicaragua) جس کے بارے میں ہیگ (The Hague) کی بین الاقوامی عدالت نے امریکہ کی سرزنش کی۔

(۵) ڈومینیکن ریپبلک۔ (Dominicon Republic)

(۶) کوسٹاریکا۔ (Costa Rica)

(۷) گرینا ڈا (Grenada)

(۸) اور سب سے بڑھ کر (Vietnam) کی طویل جنگ جو اقوام متحدہ کے زیر علم لڑی گئی اور جس میں امریکہ کو نہایت ذلت آمیز شکست ہوئی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کو یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ فلسطین کے مسئلہ کو دوسری نگاہ سے دیکھے اور کویت کے مسئلہ کو دوسری نگاہ سے۔ دونوں معاملات میں اس کا میزان عدل الگ الگ ہو۔ ۱۹۶۷ء میں شام سے حاصل کیے گئے گولان کی پہاڑیوں۔ اردن کے مغربی کنارہ بشمول قدیم بیت المقدس (Jerusalam)

---

[1] ریزولیوشن نمبر ۶۷۸

اور غازہ پٹی کو اسرائیل نے اپنی مملکت میں ضم کرلیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ۷ر جون ۱۹۶۷ء کے قبضہ کردہ یروشلم کو اس نے ۲۹ر جون ۱۹۶۷ء کو اپنا پایہ تخت قرار دے دیا۔[1] وہی یورپ اور امریکہ جن کے دلوں میں آج کویت کے لیے شدید درد اٹھ گیا ہے۔ اس وقت نہ صرف مہر بلب رہے بلکہ کھلم کھلا اسرائیل کی پشت پناہی کی اور بہتوں نے تو تل ابیب (Tel Aviv) سے یروشلم اپنے سفارت خانوں کو منتقل کرلیا۔ عرب کی ہماری یہ حکومتیں کوئی مؤثر احتجاج نہ کرسکیں۔ وہ ۱۹۸۱ء میں اسرائیل کے ذریعہ عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی پر بھی کچھ نہیں کرسکے تھے اور اس بارے میں سعودی حکومت کا حال تو یہ رہا ہے کہ یہ نہ تو ۱۹۶۷ء کی عقبہ کی ناکہ بندی میں شریک رہا نہ ہی اسے آج تک اسرائیل کے خطرہ کا کچھ احساس ہوا۔ علماء کرام بیشک اس کے لیے پریشان رہے ہوں گے۔ لیکن اس "اسلامی ملک" میں حکومت کے خلاف زبان کھولنے کی اجازت کسے حاصل ہے؟ یہ مقدس فتاوے جو آج شائع ہو رہے ہیں اگر حکومت کی موافقت میں نہ ہوتے تو کیسے شائع ہو پاتے۔

آئیے ذرا اسلامی تاریخ کو بھی عبرت پذیری کی نگاہ سے دیکھ لیں۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کے ہاتھوں ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی۔ میسور کی اس چوتھی جنگ میں انگریزوں کا حلیف صرف نظام حیدرآباد تھا۔ اس کی حکومت کے کچھ حصہ پر ٹیپو نے قبضہ کرلیا تھا۔ اس لیے انگریزوں کی اس بندر بانٹ میں وہ بھی شریک ہوگیا۔ آج دو سو سال بعد تاریخ نے اسے کس نام سے یاد رکھا ہے؟ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ (۱۱۳۷ء/۱۱۹۳ء) نے تیسری صلیبی جنگ میں ۲ر اکتوبر ۱۱۸۷ء کو بیت المقدس فتح کرلیا تھا۔ لیکن اس کے لیے اسے پوری عمر میدان جنگ میں گزارنی پڑی اور اصل مقصد کو حاصل کرنے سے پہلے بہت سے مسلم امراء اور حکمرانوں کو ختم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ فتح بیت المقدس سے دس سال قبل ۱۱۷۱ء میں اس نے قاہرہ کی فاطمی خلافت کا چراغ بھی گل کردیا کیونکہ صلیبیوں اور باطنیوں سے ان کی سانٹھ گانٹھ رہا کرتی تھی۔ ان تمام امراء اور حکمرانوں خصوصیت کے ساتھ فاطمی خلافت کو بعض علماء سوء کے فتاووں کی تائید بھی حاصل رہی ہوگی۔ لیکن اگر صلاح الدین یہ نہ کرتا تو بیت المقدس کبھی نہ فتح ہوتا اور اگر یہ لوگ

[1] Encyclopaedia Americana, Vol. 16, Page 17

ایوبی کی راہ کا روڑا نہ بنتے تو بیت المقدس بہت پہلے فتح ہو چکا ہوتا۔ بلکہ باطنیوں کا بھی قلع قمع ہو جاتا۔ پھر بھی چوتھی صلیبی جنگ میں اسے انگلستان کے شہنشاہ رچرڈ (Richard) کے ہاتھوں ۱۱۹۱ء میں عکہ (Acre) کی شکست برداشت کرنی پڑی[1] کیونکہ ان عظیم صلیبی جنگوں میں جن میں ایشیا اور یورپ کی تمام مسیحی طاقتیں یکجا تھیں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو کہیں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ حالانکہ اس زمانہ میں بین الاقوامی آمدورفت (Immigration) کے وہ قوانین نہیں تھے جو آج جاری ہیں۔ تاریخ کے اس حادثہ کا جغرافیائی تجزیہ کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ایک فتنہ جو لبنان اور ایک غار تگر اسرائیل کی بنیاد اسی دن رکھ دی گئی تھی جس دن عکہ کا سقوط ہوا تھا۔ اور اس کی ذمہ داری سے اس زمانہ کے امراء اور بادشاہ بری نہیں ہیں۔ سلطان جلال الدین محمد خوارزم شاہ کی شکست کا سبب بھی اس کے سالاروں کی پھوٹ تھی۔ سقوط بغداد اور خلافت بنو عباس کا خاتمہ (۱۲۵۸ء) بھی حنابلہ اور شیعوں کی آویزش کے نتیجہ میں واقع ہوا جبکہ عباسی خلیفہ کے شیعہ وزیر اعظم ابن علقمی نے ہلاکو خاں کو خلافت اسلامیہ پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور پورے ملک میں وہ خون خرابہ ہوا کہ شیخ سعدیؒ کو کہنا پڑا

آسماں راحق بود گر خون ببارد برزمیں　　بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

پہلی صلیبی جنگ میں سقوط بیت المقدس (۱۰۹۹ء) کا سبب بیان کرتے ہوئے ایک محقق لکھتا ہے "فتح (بیت المقدس) کا سبب عیسائی فوجوں کی شجاعت سے زیادہ یہ تھا کہ مشرق کا مسلمان باہمی افتراق کا شکار تھا اور وہ سمندر پار کے اس اچانک اور بلا اشتعال حملہ سے مبہوت رہ گیا (اس وقت) دو مخالف خاندان یعنی مصر کے فاطمی اور بغداد کے عباسی امیر المومنین ہونے کے دعوے دار تھے۔[2] اسپین کی تو نصف تاریخ ہی عیسائیوں کی "پرخلوص" دوستی کا "مقدس" نوحہ ہے۔

یہ چند مثالیں ہم نے صرف اسلامی تاریخ سے پیش کی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو تاریخ عالم میں اس کی لاتعداد مثالیں ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ تو ان مثالوں سے

---

[1] عکہ (Acre) موجودہ اسرائیل کی ایک شمالی بندرگاہ ہے۔

[2] Encyclopaedia Americana, vol. 8, Page 265

بھری پڑی ہے۔ ہر فریق جو اپنے کو برسرِ حق سمجھتا ہے وہ شرعی فتاوے بھی حاصل کر لیتا ہے کیونکہ مفتی جواب دینے میں مستفتی کے پیش کردہ الفاظ اور صورتِ حال کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ کا فتویٰ عجیب و غریب ہے۔ جب سوا یا دو سو سال بعد آج کے عالمِ اسلام کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو اس کا ریکارڈ یہی ہوگا کہ صدر صدام کی "جرأتمندانہ حماقت" کامیاب ہوگئی لیکن شاہ فہد کی "بزدلانہ فرزانگی" بالکل ناکام ہوگئی اور صلیبی اور صہیونی طاقتوں نے اپنی ریشہ دوانیوں اور بالفعل جنگی کارروائیوں سے پورے عالمِ اسلام کو دفاعی جنگی صلاحیت کے اعتبار سے بنجر کر کے رکھ دیا ہے۔

مسلم ممالک کی اپنی اقوام متحدہ تشکیل دی جانی چاہیے تاکہ بین الملی مسائل کو اس کے ذریعہ سے حل کیا جا سکے۔ اس سے قبل اُمّہ کمیٹی قائم ہوئی تھی لیکن اس کی وہ ساکھ قائم نہیں رہ سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ مجوزہ اسلامی اقوام متحدہ کو اسلامی بنیادوں پر اس طرح استوار ہونا چاہیئے کہ اس کو بہت سے اختیارات بھی ہوں۔ یہ اقوام متحدہ انشاء اللہ یہودی سازشوں کی آماجگاہ اور امریکی طاقت کی علامت نہ ہوگی۔ اگر برطانیہ اپنی دولت مشترکہ (Common Wealth) اور یورپ اپنی مشترکہ منڈی (European Common Market) بنا سکتے ہیں تو ایک اسلامی اقوام متحدہ کیوں نہیں قائم ہو سکتی۔

منصبِ خلافت کے احیاء کے لیے آج سے زیادہ کوئی وقت اس کے لیے سازگار نہیں ہوگا۔ دنیا بھر کے یہودی اپنے کو ایک قوم کہتے ہیں اور ایک مرکز سے وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ پوری عیسائی برادری اپنے مفاد کے لیے ہمیشہ یکجا ہو جاتی ہے۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ کی تاریخ آج بھی دہرائی جا رہی ہے۔ یہودی اور عیسائی اللہ کے فرمان کے بموجب مسلمانوں کے مقابل میں ایک ہو جاتے ہیں۔ خلیج کی اس جنگ کے بہانہ برطانیہ نے بارہا پورے یورپ کو متحد ہونے کے لیے غیرت دلائی ہے۔ آخر مسلمانوں کو کب ہوش آئے گا کہ خلافت کے جھنڈے تلے متحد ہوں۔

سلطان عبدالعزیز ابن سعود مرحوم نے ۱۹۲۶ء میں اس منصبِ عظیم کو ٹھکرا دیا تھا۔ افسوس کہ شاہ فیصل مرحوم کے زمانہ میں ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی سانحہ کے بعد جو ممالک اسلامیہ کی کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں مرحوم شاہ فیصل نے

خود ادارۂ خلافت کی ناموجودگی کا ماتم کیا تھا ورنہ فیصل جیسا بیدار مغز حکمراں اس منصب کا اہل تھا۔ واضح رہے کہ خلافت چاہے خاندانی رہی ہو یا برائے نام ہی قائم رہی ہو اس کا اثر پوری امت پر ہمیشہ پڑا ہے۔ سلطان محمود غزنوی حکومت غزنی میں کرتا تھا لیکن پروانۂ اجازت بغداد سے منگواتا تھا۔ ٹیپو سلطان کی حکمرانی میسور میں تھی۔ لیکن باب عالی قسطنطنیہ کے پروانۂ حکومت کو سر پر رکھتا تھا۔ یہ اس کے ملک کے لیے بڑے اعزاز اور اکرام کی بات ہے جو اس منصب جلیلہ کا احیاء کرے۔ کاش جزیرۃ العرب ہی سے اس کا احیاء ہو۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس منصب کو ایک دن بھی خالی نہیں رہنے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے پہلے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رسول چن لیا گیا۔ لیکن واضح رہے کہ خلافت اسلامیہ کو امریکہ یا برطانیہ کا تابع فرمان نہ ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے اصل دشمن یہود و نصاریٰ ہیں جن کے خلاف قرآن میں تنبیہ کی گئی ہے۔ اور احادیث میں ان سے اجتماعی جنگ کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مسلم حکمرانوں کو اس وقت کے لیے اپنے کو تیار کرنا چاہیے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور پھر وہ جنگ لڑی جائے گی جو قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔[1]

---

[1] یہودی ایک مسیح موعود کے منتظر چلے آرہے ہیں حالانکہ وہ مسیح دو ہزار سال پہلے آچکے۔ لیکن ایک مسیح کاذب دجال کی شکل میں آنے والا ہے۔ اس کو قتل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لے آئیں گے اس کی طرف قرآن میں اشارے موجود ہیں (النساء ۱۵۷ تا ۱۵۹) حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں مسیح دجال اور مسیح عیسیٰ کی آمد کی خبر دی گئی ہے اور اس کو قیامت کی نشانیوں میں بتلایا گیا ہے۔ تمام مسلمانوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے۔ نام نہاد اسرائیلی ریاست کا قیام اور دنیائے عیسویت کی طرف سے اس کی متفقہ پشت پناہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس فتنہ کی روک تھام کے لیے ابھی سے تیاری کریں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صحاح ستہ، مسند احمد، مشکوٰۃ، طبرانی اور مستدرک حاکم کے حوالوں سے مذکورہ احادیث میں سے ۲۱۔ احادیث ایک جگہ جمع کردی ہیں، ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم صفحات ۱۵۴ تا ۱۶۲۔ اس طرح یہودیوں اور عیسائیوں سے جنگ کا وقوع محض مستقبل کی ایک تاریخ نہیں بلکہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ بھی ہے۔

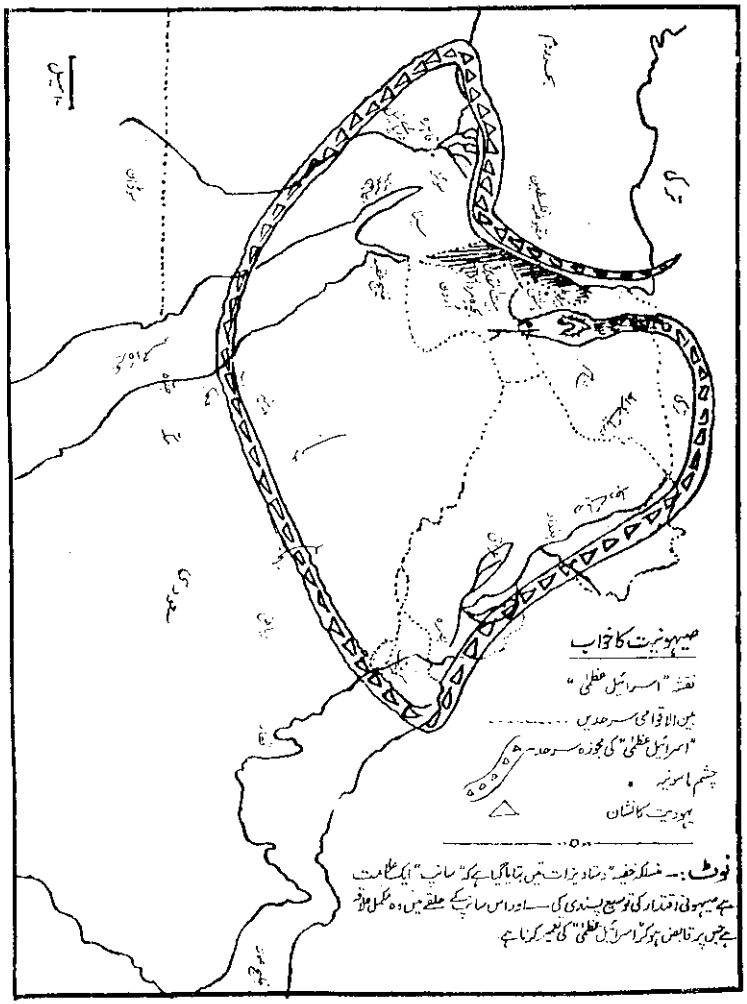
صیہونیت کا خواب
نقشہ "اسرائیل عظمیٰ"
بین الاقوامی سرحدیں
"اسرائیل عظمیٰ" کی مجوزہ سرحد
چشمہ یا سوتہ
یہودیت کا نشان
نوٹ:۔ منسلکہ خفیہ دستاویزات میں بتایا گیا ہے کہ "سانپ" ایک علامت ہے صیہونی اقتدار کی توسیع پسندی کی ۔۔۔ اور اس سانپ کے حلقے میں وہ مکمل علاقہ ہے جس پر قابض ہو کر "اسرائیل عظمیٰ" کی تعمیر کرنا ہے

ہندوستان میں

علماء و محدثین کی دینی خدمات

مولانا غازی عزیر

برصغیر پاک و ہند میں محدثین اور علم حدیث کی اشاعت کے موضوع پر بہت سے علماء اور محققین نے زور قلم صرف کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں اکثر معلومات ناقص ہیں۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ پہلی چھ صدیوں تک بلادِ ہند میں حدیث کی تعلیم و تدریس، روایت حدیث اور محدثین نیز ان کی تصانیف کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔ جن لوگوں نے اس سے قبل محدثین کے وجود کو تسلیم کیا ہے وہ بھی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اگرچہ فن حدیث ہندوستان میں چھٹی صدی ہجری سے قبل موجود تھا لیکن اس فن میں علمائے وقت کو کوئی قابلِ لحاظ مقام و مرتبہ حاصل نہ تھا۔ بعض علماء نے تو ہندوستان میں علم حدیث کی آمد کو دسویں صدی ہجری کا واقعہ بتایا ہے، چنانچہ علامہ زاہد کوثری حنفی کے حوالہ سے استاذ محمد ابوزہرہ مصری اپنی کتاب "الحدیث والمحدثون" میں لکھتے ہیں:

> "برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں نے حدیث نبوی کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ دسویں صدی ہجری سے قبل یہ لوگ علوم نظریہ اور فقہی احکام میں منہمک رہتے تھے۔ اسی وقت سے یہ لوگ حدیث نبوی، اس کے علوم کی درس و تدریس، نقد اسانید کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھنے لگے [1]"

---

[1] تاریخ حدیث و محدثین (اردو ترجمہ الحدیث والمحدثون) از غلام احمد حریری ص ۵۸۸ طبع لاہور

اس ناقص تحقیق سے بلادِ ہند کی دینی و علمی تاریخ میں بڑا خلا محسوس ہوتا ہے۔ دراصل اس غلط فہمی کا بڑا سبب خاطر خواہ تتبع و تحقیق کا فقدان ہے۔ پھر جس طرح کہ فقہائے ماوراء النہر کی تصانیف نے ائمہ احناف کی امہات الکتب کو پیچھے ڈھکیل دیا تھا اسی طرح اوّلین دور کے ان محدثین اور علماء کے علمی کارناموں (یعنی تصانیف، مدارس اور تلامذہ وغیرہ) کو بھی ہمارے علمائے عجم کے فکری سیلان اور ان کے شیوع و رواج نے اس بری طرح بہاڑ الا کہ اس دور کی تاریخ کے صفحات بالکل کورے نظر آتے ہیں۔

پیشِ نظر مضمون میں اقالیم ہند و سندھ میں علم حدیث کے فروغ کے لیے کی جانے والی ابتدائی چند صدیوں کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے جو ہندوستان میں علم حدیث کا عہد زریں کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق برصغیر کے چند علاقے پہلی صدی ہجری کی ابتدا ہی میں علم حدیث اور اخبر نا و حدثنا کے جانفزا کلمات سے باقاعدہ آشنا ہو گئے تھے۔ پہلی جماعت جس نے اپنے قول و عمل سے باشندگان ہند کو علم حدیث سے روشناس کرایا وہ ان صحابۂ کرام پر مشتمل تھی جو عہد عمر فاروقؓ سے عہد یزید (یعنی سنہ ۱۵ھ تا سنہ ۶۴ھ) تک مختلف اوقات و مواقع پر ہندستان تشریف لائے۔ یہ جماعت ان نفوس قدسیہ پر مشتمل تھی جو برصغیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے اولین مبلغ، آپؐ کے ارشادات گرامی کے پہلے داعی، اپنی ذات میں آں صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و عمل کے آفتاب جہاں تاب کی کرنوں کے آئینہ دار، اپنے اعلیٰ اخلاق، اعمال، عادات، اطوار، کردار اور معاملات وغیرہ کے باعث اپنے مخاطب ہندوستانیوں کو بہت جلد متاثر کرنے والے تھے۔ ان کی آمد سے ہی اس دیار کفر میں کتاب اللہ اور سنت رسول بالخصوص فرائض، سنن، احکام، حلال و حرام اور اس دور کے رواج و مزاج کے مطابق حسب موقع اور حسب ضرورت احادیث و آثار کا چرچا ہوا۔ پھر جب باقاعدہ احادیث کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں انہی حضرات سے احادیث و آثار کی روایت کا سلسلہ بھی چلا۔ خلافت راشدہ کے دوران ہندوستان تشریف لانے والے صحابہ کرام کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں:

"سندھ میں محمد بن قاسم کی فتوحات سے پہلے حضرات عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانوں میں صحابہ نے ان اطراف کے اکثر علاقے فتح کر لئے تھے۔ وہ شام، مصر، عراق، یمن اور اوائل ترکستان کے وسیع و عریض اقالیم میں پہنچے اور

علاقہ ماوراء النہر، اوائل بلاد مغرب و افریقہ اور اوائل بلادِ ہند میں بھی داخل ہوئے۔"[1]

اسی طرح ڈاکٹر این میری شمل "شہپر جبریل" (GABRIEL'S WINGS) میں لکھتی ہیں:

"خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان عساکر نے سندھ اور گجرات کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا تھا اور بعد کے خلفاء کے عہد تک یہ تسلط برقرار رہا۔"[2]

چونکہ خلافتِ راشدہ اور اموی دورِ خلافت میں سندھ، مکران اور سجستان کی فتوحات فارس کی مہمات میں شامل تھیں اور انہی راستوں سے غازیان اسلام بلادِ ہند کی طرف آئے لہذا اوپر بلادِ ہند سے مراد سندھ، مکران، سجستان اور بلوچستان وغیرہ کے علاقے ہیں جو کہ اقلیم فارس سے متصل ہیں۔

بعض محققین بیان کرتے ہیں کہ برصغیر کی سرزمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پچیس[25] صحابہ کرام کے ورود مسعود سے بہرہ ور ہوئی جن میں سے بارہ[12] حضرت عمر بن الخطاب کے عہد خلافت میں، پانچ حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہد میں، تین[3] حضرت علی بن ابی طالبؓ کے دور میں، چار حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں اور ایک یزید بن معاویہ کے عہد میں تشریف لائے تھے۔ ان صحابہ کے علاوہ مختلف اوقات میں بلادِ عرب سے اقالیم ہند میں متعدد تابعین و تبع تابعین آتے رہے جن کا شب و روز کا مشغلہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت تھا۔ یہ باشندگانِ ہند کو دین فطرت کے تہذیبی و ثقافتی دائرہ میں شامل کرنے اور ان کو ان پاکیزہ اخلاق و کردار اور تعلیم و شائستگی کی اعلیٰ اقدار سے بہرہ مند کرنے کی سعی کرتے رہے جن کو اسلام میں اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ غرض اس مقصد کے لیے بلادِ عرب سے ہندوستان تشریف لانے والے تابعین کی تعداد تقریباً سینتیس اور تبع تابعین کی تعداد تقریباً پندرہ[15] بیان کی جاتی ہے۔ ہندوستان تشریف لانے والے تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اصل اعداد و شمار یقیناً اس تعداد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ یہ مختصر مضمون ان تمام نفوسِ قدسیہ کے تفصیلی تذکرہ کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا، ذیل میں ہندوستان کو اپنے وجود مسعود سے رونق بخشنے والے صحابہ و تابعین کرام میں سے چند کے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۹ ص ۸۸ و معرفۃ الرجال ص ۲۳۴

[2] شہپر جبریل مترجم ڈاکٹر محمد ریاض ص ۱۴/۲۹۷

مختصر حالات پیش خدمت ہیں :

(۱) والی بحرین وعمان حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو طائف کا امیر بنایا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پورے عہدِ خلافت میں اور حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں آپؓ کو طائف کی امارت پر برقرار رکھا، بعد میں بحرین وعمان کی ولایت کی ذمہ داری آپؓ کو سونپ دی گئی تھی۔ آپؓ ایک عظیم مجاہد تھے۔ علامہ ابن حزم الظاہریؒ فرماتے ہیں :

"عثمان بن ابی العاصؓ اپنے بھائیوں میں بہترین صحابیٔ رسول ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں طائف کا امیر مقرر فرمایا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے تین شہروں میں جہاد کیا ہے۔"

حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ سے ان کے بھتیجے یزید بن الحکم بن ابی العاص، ان کے مولی حکم، سعید بن المسیب، موسیٰ بن طلحہ، نافع بن جبیر بن مطعم، ابو العلاء بن الشخیر اور مطرف بن الشخیر وغیرہ نے حدیث کی روایت کی ہے۔ حافظ ابن عبد البرؒ کا قول ہے کہ "ان سے اہلِ مدینہ اور اہلِ بصرہ نے حدیث کی روایت کی ہے"۔ امام احمد بن حنبلؒ نے حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ،

"میں نے عثمان بن ابی العاصؓ سے افضل کسی کو نہیں پایا۔ ہم لوگ ان کے مکان پر جاکر ان سے حدیث کی روایت کرتے تھے"۔[۱]

(۲) حضرت حکم بن ابی العاص الثقفیؓ

مشہور مورخ احمد بن یحیی البلاذری بیان کرتے ہیں کہ "عہد فاروقی ۱۵ھ میں والیٔ بحرین وعمان حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص الثقفیؒ کو گجرات کے شہر بھڑوچ کی مہم پر روانہ کیا تھا چنانچہ یہ مقام اسلام کے زیر نگیں آگیا تھا"[۲] پھر ۲۳ھ میں حکم بن ابی العاصؓ کی سرکردگی ہی میں مکران کا علاقہ بھی فتح ہوا[۳]

حکم بن ابن العاص الثقفیؓ کو امام ابن حبانؒ اور حافظ ابن عبد البرؒ وغیرہ نے بصرہ کے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۱۰، تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۷، ص ۱۲۸، معرفۃ الثقات للعجلی ج ۲ ص ۱۲۹، الاصابہ لابن حجر عسقلانی ج ۲ ص ۴۵۳، الاستیعاب فی اسماء الصحابہ للقرطبی المالکی علی ہوامش الاصابہ ج ۳ ص ۹۰ [۲] فتوح البلدان للبلاذری ص ۴۳۸ [۳] البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۶ ص ۱۴۱

علمائے محدثین میں شمار کیا ہے لیکن بعض علماء نے ان سے مروی احادیث کو مرسل بتایا ہے چنانچہ عجلیؒ نے انھیں "ثقہ تابعی لکھا ہے جب کہ ابن سعد، ابوحاتم اور ابن حجر رحمہم اللہ نے ان کے متعلق صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانے کی صراحت کی ہے۔ ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں معاویہ بن قرۃ کا نام قابلِ ذکر ہے[1]

(۳) حضرت مغیرہ بن ابی العاص الثقفیؓ

آپؓ بھی حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ کے بھائی تھے۔ عہد فاروقی میں والیٔ بحرین و عمان حضرت عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ نے آپؓ کو سندھ کے شہر دیبل پر لشکر کشی کے لیے روانہ کیا تھا۔ حضرت مغیرہؓ نے اس معرکہ میں فتح پائی تھی[2]

(۴) حضرت حکم بن عمرو الثعلبیؓ

آپ کے متعلق مورخین نے کئی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت حکم الثعلبیؓ رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی تھے جنھوں نے حضرت عمر کے عہد خلافت (یعنی ۲۳ھ) میں مکران کا محاصرہ کیا اور وہاں کے راجا کو شکست فاش دی۔ ابوحاجب سوادہ بن العاصم، ابوالشعثا و لجہ بن القیس، جابر بن زید الازدی اور عبداللہ بن الصامت وغیرہ نے آپؓ سے حدیث کی روایت کی ہے[3]

(۵) حضرت صحار بن عباس العبدیؓ

حضرت صحارؓ نے عہد فاروقی (یعنی ۲۳ھ) میں حضرت حکم بن عمرو الثعلبیؓ کی امارت میں مکران کے محاصرہ اور جنگ میں شرکت کی تھی۔ آپ ہی وہ صحابیٔ رسول تھے جنھیں حضرت حکم بن عمرو الثعلبیؓ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس فتح مکران کی خوش خبری اور حاصل شدہ مال غنیمت

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: معرفۃ الثقات للعجلی ج ۱ ص ۳۱۲ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۳ ص ۱۲۰، تجرید اسماء الصحابہ للذہبی ج ۱ ص ۱۳۵ اصابہ لابن حجر ج ۱ ص ۳۴۴، استیعاب للقرطبی ج ۱ ص ۳۱۵ تاریخ الکبیر للبخاری، البدایہ والنہایۃ، فتوح البلدان [2] ملاحظہ ہو فتوح البلدان للبلاذری ص ۴۳۸ [3] اصابہ لابن حجر ج ۱ ص ۳۴۶ تاریخ الطبری ج ۴ ص ۱۸۱

لے کر روانہ کیا تھا۔

محمد بن اسحاق النّدیم اپنی "فہرست" میں فرماتے ہیں کہ "صحار العبدیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو یا تین حدیثیں روایت کی ہیں۔ ایام معاویہ میں ان کا شمار خطباء اور نسابین میں ہوا کرتا تھا۔" آپ سے حدیث کی روایت کرنے والوں میں منصور بن منصور اور ان کے دو صاحبزادے (جعفر بن الصحار العبدی اور عبدالرحمن بن الصحار العبدی) ہیں[1]

(۶) حضرت عبداللہ بن عمیر الاشجعیؒ

حضرت ابن عمیر الاشجعیؓ بھی عہد فاروقی یعنی سنہ ۲۳ھ میں مکران، فارس اور سجستان کے معرکوں میں شریک تھے اور آپ نے شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ سجستان سے متصل علاقہ سندھ میں بھی آپ کی فوجی سرگرمیوں کی شہادت ملتی ہے۔ ابن الوقدان نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ ابن مندہؒ اور ابن ابی حاتمؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعیؓ کی مروی احادیث کی تخریج کی ہے[2]

(۷) حضرت سہل بن عدی بن مالک بن حرام الخزرجیؓ

حضرت عمر بن الخطابؓ نے آپؓ کو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس بصرہ اس فرمان کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ آپ کو ہندوستان کے جہاد پر روانہ کریں، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت سہل بن عدیؓ کو کرمان کی مہم پر روانہ کیا۔ کرمان آپ کے ہاتھوں فتح ہوا[3]

(۸) حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان الاموی

عہد فاروقی میں حضرت سہل بن عدیؓ کی امارت میں آپؓ نے کرمان کے معرکہ میں جہاد کیا تھا۔ ابوالشیخؒ نے آپ کا تذکرہ اپنی تاریخ میں کیا ہے[4]

---

[1] اصابہ لابن حجر ج ۲ ص ۱۶۰-۱۶۱، استیعاب للقرطبی ج ۲ ص ۱۹۳ فہرست لابن ندیم وغیرہ

[2] اصابہ لابن حجر ج ۲ ص ۳۴۶، استیعاب للقرطبی ج ۲ ص ۳۵۳

[3] اصابہ لابن حجر ج ۲ ص ۸۸ [4] ایضاً ج ۲ ص ۳۲۸
۳۰۰

(۹) حضرت عاصم بن عمرو التمیمی

حضرت عمرؓ نے آپؓ کو حضرت سہل بن عدیؓ کے ساتھ سجستان کے معرکہ پر روانہ کیا تھا۔ اس مہم میں آپ نے خوب داد شجاعت پیش کی۔ محدثین کے نزدیک آپ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پانا اور آں صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث درست نہیں ہے[۱]۔

(۱۰) حضرت ربیع بن زیاد الحارثیؓ

امام بخاریؒ، ابن ابی حاتمؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ نے آپ کو تابعین میں شمار کیا ہے لیکن بعض کے نزدیک آپ کو شرف صحابیت حاصل ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عامر نے ۲۹ھ میں آپ کو سجستان کی مہم کے لیے امیر مقرر کیا تھا اور یہ علاقہ آپ کی سرکردگی میں فتح ہوا تھا۔ عبداللہ بن ابی بکرہ نے انھیں خراسان و بلخ کا والی مقرر کر کے بھیجا تو یہ علاقے بھی آپ کے ہاتھوں ہی فتح ہوئے۔ سندھ کی قدیم ترین عربی تاریخ "چچ نامہ" اور "المبرد فی الکامل" میں مذکور ہے کہ "امیر بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ان کو مکران و کرمان کے شہ سواروں کا امیر مقرر فرمایا تھا"۔ آپؓ سے کوئی مسند حدیث مروی نہیں ہے۔ آپؓ نے فقط حضرت عمر بن الخطابؓ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ ابن حبیب اور ابن کلبی وغیرہ نے آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ مطرف بن الشخیر اور حفصہ بنت سیرین نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے[۲]۔

(۱۱) حضرت عبید اللہ بن معمر بن عثمان التیمی القرشیؓ

آپؓ کو حضرت عثمان نے ۲۹ھ میں مکران کی مہم پر روانہ فرمایا تھا۔ علامہ قرطبی مالکیؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت عبید اللہ بن معمر نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کی معیت میں فتح کابل وغیرہ میں شرکت کی تھی۔ آپ صاحب ثغرہ (گندھا) تھے"۔ لڑکپن میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا

---

[۱] اصابہ لابن حجر ج ۲ ص ۲۳۸ استیعاب ج ۳ ص ۱۳۵ [۲] تفصیل کے لیے دیکھیے: چچ نامہ ص ۴۳، اصابہ ج ۱ ص ۴۹۲، استیعاب ج ۱ ص ۵۰۳، تقریب التہذیب ج ۱ ص ۲۴۴ مبرد فی الکامل، ثقات لابن حبان، الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم اور تاریخ الکبیر وغیرہ۔

اور صحبت نبوی پائی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرات عمر، عثمان اور طلحہ رضی اللہ عنہم سے آپ نے حدیث روایت کی ہے۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں عروہ بن الزبیر، ابن سیرین اور آپ کے فرزند عمر بن عبید اللہ بن معمر وغیرہ شامل ہیں۔ ابو عاصمؒ، بغویؒ اور ابن مندہ وغیرہ نے آپ سے مروی حدیث کی تخریج کی ہے۔ ابن مندہ کا قول ہے کہ:

"علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضرت عبید اللہ بن معمرؓ نے صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پائی تھی یا نہیں"۔[1]

(۱۲) حضرت مجاشع بن مسعود بن ثعلبہ السلمیؓ

آپؓ نے ۳۱ھ میں قفص اور کرمان کے علاقوں کو فتح کیا۔ جب دشمن کی ہزیمت خوردہ افواج کے مکران میں جمع ہونے کی خبر آپ تک پہنچی تو حضرت مجاشع نے مکران پر حملہ کر کے اسے بھی زیر کیا تھا۔ دولابی نے بیان کیا ہے کہ

"حضرت مجاشع نے بلاد ہند میں کابل وغیرہ کے معرکوں میں حصہ لیا اور ان علاقوں کو زیر کیا تھا، آپ وہاں کے مندروں میں داخل ہوئے اور بڑے بت کی آنکھوں میں سے جواہرات نکال لئے"۔

بعض مورخین یہ بتاتے ہیں کہ "آپ نے وہ جواہرات لئے نہیں تھے بلکہ وہاں کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے بت کی آنکھوں سے نکالے تھے کہ یہ بت نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ کسی کو نقصان"۔ امام بخاری وغیرہ کا قول ہے کہ حضرت مجاشع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پانے کا شرف حاصل ہے۔ صحیحین میں آپ کی مرویات موجود ہیں۔ ابو ساسان الرقاشی، حصین بن المنذر، یحیی بن اسحاق، ابو عثمان النہدی، کلیب بن شہاب اور عبد الملک بن عمیر وغیرہ نے آپ سے احادیث کی روایت کی ہے۔[2]

(۱۳) حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ بن حبیب العبشمی القرشی

امام بخاریؒ نے حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہؓ کے متعلق صحبت نبویؐ پانے کی صراحت کی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے اصابہ ج ۲ ص ۴۳۲، استیعاب ج ۲ ص ۴۲۵-۴۲۶، تاریخ الکبیر للبخاری اور الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم وغیرہ۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۲۲۹، اصابہ ج ۳ ص ۳۴۲، استیعاب ج ۳ ص ۴۹۹

آپ نے یوم الفتح کو اسلام قبول کیا اور غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ یہ وہ صحابیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنھوں نے عہد عثمانی میں سجستان، زابلستان، رخج، کابل، داور، سندھ اور مکران کی بعض مہمات میں مجاہدانہ سرگرمیاں دکھائی تھیں۔ ابن سعدؒ بیان کرتے ہیں کہ "عبداللہ بن عامر نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کو سجستان، خراسان اور کابل وغیرہ کی جنگوں کے لیے امیر مقرر کیا تھا۔ ان مہموں میں آپ کے ساتھ حسن بن ابی الحسن، مہلب بن ابی صفرہ اور قطری بن الفجاۃ وغیرہ شریک تھے۔ یہ علاقے آپ کی سرکردگی میں فتح ہوئے۔ آپ سے حدیث کی روایت کرنے والوں میں عبداللہ بن عباس، قتاب بن عیر، حصان بن کاھل، سعید بن المسیب، محمد بن سیرین، حسن بصری، ابولبید اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ وغیرہ جیسے نامور تابعین شامل ہیں[1]۔

(۱۴) حضرت سنان بن سلمہ المحتبق الہذلیؓ

حضرت سنانؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت کا شرف حاصل ہے مگر سماع کا نہیں ہے۔ آپ نے حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباس اور اپنے والد سلمہ بن المحتبقؓ سے مرسل احادیث روایت کی ہیں۔ عجلیؒ نے انھیں "بصرہ کا ثقہ تابعی" بتایا ہے۔ پہلی بار ۴۲ھ میں بسلسلہ جہاد بلاد سندھ تشریف لائے پھر جب امیر معاویہؓ نے انھیں زیاد کے پاس ہندوستان کی فتوحات میں شرکت کے لیے بھیجا تو زیاد نے حضرت سنان بن سلمہ کو ۵۰ھ میں ہندوستان کی مہمات کے لیے امیر بنا کر بھیجا۔ آپ نے سندھ کے علاقہ میں بہت سی فتوحات کیں۔ سلمہ بن جنادہ، معاذ بن سعوہ اور ابوعبدالصمد حبیب نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرت سنان سے قتادہ کی احادیث مدلس ہیں۔ ابن شاہینؒ نے سلمہ بن جنادہ کی روایت سے ان کی حدیثیں وارد کی ہیں۔ حضرت سنان کا انتقال حجاج کی امارت کے اواخر میں ہوا تھا[2]۔

(۱۵) حضرت منذر بن جارود العبدیؓ

ہندوستان کی فتوحات کے سلسلہ میں حضرت منذرؓ کو "ثغر قندابیل" یعنی موجودہ

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: اصابہ ج ۲ ص ۳۹۳، استیعاب ج ۲ ص ۳۹۴ تاریخ الکبیر للبخاری اور طبقات الکبریٰ لابن سعد وغیرہ [2] تفصیلات کے لیے دیکھئے، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۳۳۴، اصابہ لابن حجر ج ۲ ص ۱۳۱ تحفۃ اللطیفہ للسخاوی ج ۲ ص ۱۹۵، تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۴ ص ۲۴۱، معرفۃ الثقات للعجلی ج ۱ ص ۴۳۸، استیعاب للقرطبی ج ۲ ص ۵۰

"گندا" اور "بلوچستان" کے علاقوں کا امیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اسی سال آپ نے وفات پائی اور وہیں مدفون ہو کر ارض ہند کو ایک صحابی رسول کی امین ہونے کا شرف بخشا۔[1]

(۱۶) حضرت عمرو بن عثمان بن سعد التیمیؓ

آپ سندھ و مکران کی فتوحات کے سلسلہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔[2]

(۱۷) حضرت خریت بن راشد الناجیؓ

آپ کو عبد اللہ بن عامر نے سندھ، مکران اور بلاد فارس کی فتوحات و امارت کے لیے مامور کیا تھا۔[3]

(۱۸) حضرت تمیم الداریؓ

آپ سنہ ۹ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ آپ کے متعلق ایک زبان زد روایت یہ ہے کہ آپ جنوبی ہند میں فتوحات کے پیش نظر نہیں بلکہ تبلیغ اور اشاعت اسلام کی غرض سے تشریف لائے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔ مدارس کے نواحی ساحل "کوڈلم" پر آج بھی ان کی قبر ان کے ورود مسعود کی شہادت دینے کے لیے موجود ہے۔ بعض لوگ حضرت تمیم الداریؓ کو صحابی رسول اور بعض تابعی بتاتے ہیں۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے حضرت تمیم الداریؓ کو صحابی رسول کی حیثیت سے شمار کیا ہے[4] لیکن کتب اسماء الصحابہ میں ان بزرگ کا ترجمہ راقم کو کہیں نہ مل سکا۔ البتہ ایک اور مشہور صحابی رسول جن کا نام بھی حضرت تمیم الداریؓ ہے کے متعلق متداول کتب میں مذکور ہے کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بیت المقدس میں سکونت اختیار کر لی تھی، جامع ترمذیؒ وغیرہ میں ان کی مرویات موجود ہیں۔[5]

---

[1] ملاحظہ ہو اصابہ ج ۳ ص ۴۳۹، استیعاب ج ۳ ص ۴۴۱ [2] ملاحظہ ہو: اصابہ ج ۳ ص ۷ استیعاب ج ۲ ص ۴۹۱ [3] ملاحظہ ہو: اصابہ ج ۱ ص ۴۲۳ استیعاب ج ۱ ص ۴۵۳-۴۵۴ [4] خلافت راشدہ اور ہندوستان۔ مصنفہ قاضی اطہر مبارکپوری [5] ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۳ء ملاحظہ ہو اصابہ ج ۱ ص ۱۹۱ استیعاب ج ۱ ص ۱۸۶ تقریب التہذیب ج ۱ ص ۱۱۳

واضح رہے کہ سرزمین سندھ وہند کو شرف قدم بوسی بخشنے والے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، پھر جن صحابہ نے مکران، نہرج، صیال پایا، دیبل، بلوچستان، سندھ، گندا، زابلستان، رخج، کابل، داور، سجستان اور کرمان وغیرہ کی متعدد بار ہونے والی فتوحات میں حصہ لیا ان کے تلامذہ یعنی تابعین اور تبع تابعین کی ایک کثیر تعداد بھی ان کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائی، جن سب کا تذکرہ اس مختصر مضمون میں تو ممکن نہیں البتہ ان میں سے چند مشہور تابعین کا ذکر خیر ذیل میں پیش خدمت ہے۔

۱۔ اس سعید جماعت کے ایک بزرگ مشہور تابعی **سعد بن ہشام بن عامر انصاری المدنیؒ** تھے جو حضرت انسؓ کے چچازاد بھائی تھے ان کو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت **ہشام بن عامر انصاریؓ** وغیرہ جلیل القدر اصحاب رسول سے سماع حدیث کا شرف حاصل تھا۔ جن حضرات نے آپ کے حلقہ درس حدیث میں شمولیت کی ان میں حسن بصریؒ، حمید بن ہلالؒ، زرارہ بن ابی اوفیؒ اور حمید بن عبدالرحمٰنؒ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ثقہ تھے اور محدثین کے طبقۂ سوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ہندوستان میں شہادت پائی تھی"[1] ایک روایت میں یہ صراحت بھی ہے کہ "سعد بن ہشام نے سرزمین ہند میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شہادت پائی تھی۔ امام ابن حبان بیان کرتے ہیں کہ "مکران میں دوران غزوہ جام شہادت نوش فرمایا تھا"۔ امام بخاریؒ نے بھی اپنی "تاریخ الکبیر" میں سعد بن ہشامؒ کے متعلق لکھا ہے: قُتِلَ فِی اَرْضِ مکرانَ عَلٰی اَحْسَنِ حالِہٖ یعنی وہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ مکران میں شہید کئے گئے۔ تفصیل کے لیے ثقات لابن حبان، تاریخ الکبیر للبخاریؒ اور تقریب التہذیب لابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ کی جانب مراجعت مفید ہوگی۔

(۲) مہلب بن ابی صفرہؓ

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت یعنی ۴۴ھ میں آپ نے سجستان، خراسان اور کابل

---

[1] ملاحظہ ہو: تقریب التہذیب ج ۱ ص ۲۸۹

کے معرکوں میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ العبشمیؓ کے ساتھ مجاہدانہ شرکت کی تھی۔ بلاذری کا قول ہے کہ: "مہلب بن ابی صفرہ نے ۴۴ھ میں ہندوستان کی سرحد پر حملہ کیا اور بنہ اور لاہور تک پہنچا جو ملتان اور کابل کے درمیان ہیں۔" میاں اخلاق احمد (ایم۔اے) بیان کرتے ہیں کہ "حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں مہلب بن مغیرہ کی فوجوں نے کابل اور ملتان کے درمیان بعض علاقوں کو فتح کیا اور یہاں کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کرایا۔[1] امام ابن حجر عسقلانیؒ بیان فرماتے ہیں: "ثقات امراء میں سے تھے۔ جنگی تکنیک سے بخوبی واقف تھے لہذا آپ کے دشمنوں نے آپ پر کذب کا بہتان لگایا ہے۔ آپ کا تعلق تابعین کے طبقہ دوم سے ہے۔ آپ سے مرسل روایت مروی ہیں۔"[2]

(۳) قطری بن الفجاءۃؒ

آپ کو بھی سجستان، خراسان اور کابل کی فتوحات میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ العبشمیؓ کے ساتھ شرکت کا شرف حاصل ہے۔[3]

(۴) حسین بن ابی الحسن البصریؒ

آپ کا شمار سادات تابعین میں ہوتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کو آپ نے بچشم خود دیکھا اور ان کے خطبہ کو سنا تھا۔ اگرچہ حضرت علیؓ کو بھی آپ نے دیکھا تھا مگر ان سے آپ کا سماع ثابت نہیں ہے۔ احادیث کی روایت میں بکثرت ارسال و تدلیس سے کام لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ العبشمیؓ کے ساتھ آپ نے سجستان، خراسان اور کابل وغیرہ کی جنگوں میں ۴۴ھ میں بغرض جہاد شرکت کی تھی۔

---

[1] دوقدیم صوفی مرتبہ میاں اخلاق احمد ص۴۲ [2] تقریب التہذیب ج ۲ ص۲۸۰ [3] اصابہ لابن حجر ج ۱ ص۱۹۱
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: جامع التحصیل للعلائی ص۱۳۵، اصابہ لابن حجر ج ۱ ص۱۹۱، تہذیب الکمال للمزی ج ۱ ص۲۵۵، ۲۵۹، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص۱۶۵، تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱ ص۷۱، تعریف اہل التقدیس لابن حجر ص۵۶

(باقی ص۹۵ پر)

(۵) راشد بن عمرو بن قیس الازدیؒ:

یہ مشہور تابعی بھی بلاد سند و ہند کے بعض معرکوں میں شریک رہے ہیں۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ہرمز بھی فتح کیا تھا۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ "اہالیان سندھ کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے راشد بن عمرو الازدی نے بہت جد و جہد کی تھی۔ علاقۂ سندھ کے ہی ایک جہاد میں آپ نے شہادت پائی تھی۔"

(۶) حارث بن مرہ العبدیؒ

حارث بن مرہ العبدی بھی ایک مشہور تابعی تھے جو حضرت علیؓ کے شاگرد اور معاون خاص بھی تھے۔ آپ کا تعلق قبیلہ عبد القیس سے تھا۔ ۳۷ھ میں جنگ صفین کے موقع پر حضرت علیؓ کی فوج کے میسرہ پر آپ ہی مقرر تھے۔ ۳۸ھ میں حضرت علیؓ کے حکم سے حدود ہند میں داخل ہوئے اور وہاں اپنی فیاضی، وسعتِ علم اور شجاعت کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ ایک روایت کے مطابق حارث بن مرہ العبدی نے حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ معرکۂ قلات میں شہادت پائی۔" آپ کبار صحابہ سے ملے تھے اور ان سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ "مدرک صحابہ میں سے تھے۔"

بعض تابعین کرام حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں اس وقت ہندوستان تشریف لائے تھے جب ۴۴ھ میں مسلمان افواج ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر حملہ آور ہوئیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۶۶)

معرفۃ الثقات للعجلی ج ۱ ص ۲۹۳، تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۲۶۳، الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۴۰-۴۲ تاریخ یحییٰ بن معین ج ۴ ص ۲۲۹، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۲ ص ۲۹، علل لابن مدینی ص ۵۱-۵۳، ھدی الساری لابن حجر ص ۳۶۷، فتح الباری لابن حجر ج ۱ ص ۱۰۹ ج ۲ ص ۲۶۸ ج ۴ ص ۴۱۹ ج ۵ ص ۸۹، ۲۴۱، ۳۰۷ ج ۶ ص ۴۳۷ ج ۹ ص ۲۲۲، ۳۸۲، ۴۰۳ ج ۱۰ ص ۲۷۷ ج ۱۱ ص ۶۹ ج ۱۲ ص ۸۰ ج ۱۳ ص ۶۶، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۱ ص ۵۳۱، ۵۳۷، ۵۳۸ ج ۴ ص ۴۳۶، ۵۲۰، ۶۸۶ ج ۶ ص ۵۹۱ ج ۷ ص ۱۲۱، ۲۹۷، ۴۸۴ ج ۸ ص ۱۹۹ ج ۹ ص ۱۶۷، نصب الرایہ للزیلعی ج ۱ ص ۴۸۲، ۵۱، ۸۸، ۹۲ تا ۱۷۴، ۲۰۵، ۲۰۲ ج ۲ ص ۹۲، ۱۲۶، ۱۵۱، ۱۹، ۴۷۶ ج ۳ ص ۲۲۱، ۳۸۶ ج ۴ ص ۳۹، ۴۸، ۱۶۴، ۱۶۷، ۲۰۰، ۲۱۲، سنن الدارقطنی ج ۱ ص ۱۰۲، سنن الکبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۱۶۸ ج ۵ ص ۳۸۸، ۳۵۲ ج ۶ ص ۴۲ ج ۸ ص ۲۰۵ ج ۱۰ ص ۷۰ تا ۸۱، مستدرک للحاکم ج ۱ ص ۷۱ ج ۲ ص ۳۵ ۳۰۷

امیر معاویہؓ کے عہد میں معرکۂ ہندوستان کے متعلق امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "وقد غزا المسلمون الهند فی ایام معاویة سنة ۴۴ھ"[1] خیر القرون کے ان مسلمانوں کے پیش نظر ہندوستان پر لشکر کشی کا مقصد جہاں اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ تھا وہیں غزوۂ ہند کے بارے میں مندرجہ ذیل احادیث بھی زبردست محرک تھیں۔

۱۔ عن ابی هریرة قال وعدنا رسول الله صلی الله علیه وسلم غزوة الهند فان ادرکتها انفق فیها نفسی و مالی فان اقتل کنت من افضل الشهداء وان ارجع فانا ابو هریرة المحرر"[2]

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ہندوستان میں غزوہ کا وعدہ فرمایا ہے اگر میں اس میں شریک ہوا تو اس میں اپنی جان ومال خرچ کروں گا، اگر مارا گیا تو بہترین شہید ہوں گا اور اگر زندہ واپس آگیا تو جہنم سے آزاد ابوہریرہ رہوں گا۔"

(نوٹ: حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری روایت میں "فان اقتل کنت من افضل الشهداء وان ارجع" الخ کے بجائے "وان قتلت کنت افضل الشهداء فان رجعت" الخ کے الفاظ مروی ہیں۔[3])

۲۔ عن ثوبان مولی رسول الله صلی الله علیه وسلم قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم عصابتان من امتی حرزهما الله من النار عصابة تغزوالهند وعصابة تکون مع عیسی بن مریم علیهما السلام"[4]

ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دو گروہوں کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے، ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم کے ساتھ رہے گا۔

---

[1] البدایہ والنہایۃ لابن کثیر ج ۶ ص ۲۲۳ [2] سنن نسائی مع تعلیقات السلفیہ ج ۲ ص ۵۶ وکذا فی البدایۃ والنہایہ لابن کثیر ج ۹ ص ۹۵ سبحۃ المرجان از غلام علی آزاد ص ۲۱ خلافت راشدہ اور ہندوستان للقاضی اطہر مبارکپوری ص ۳۶

[3] سنن نسائی مع تعلیقات السلفیہ ج ۲ ص ۵۶ [4] ایضاً

حضرت ثوبان سے مروی ایک دوسری حدیث میں "حوضی" کے بجائے "احوضی" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اس کی تخریج امام طبرانیؒ نے "معجم الاوسط" میں کی ہے مگر طبرانیؒ کی اسناد روایت میں تابعی کا نام ساقط ہے جو بظاہر راشد بن سعد ہے۔ "اسناد کے بقیہ رجال ثقات ہیں" جیسا کہ علامہ ہیثمیؒ نے تصریح فرمائی ہے۔[1]

خلافت راشدہ اور اموی دور حکومت میں اقلیم ہند پر جن عسکری کوششوں کی ابتداء ہوئی تھی وہ اگرچہ بہت منظم اور وسیع پیمانہ پر نہ تھیں مگر ان کا سلسلہ برابر جاری رہا حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۶۳۲ء) کے تقریباً اسی سال بعد ۹۳-۹۴ھ (بمطابق ۷۱۲ء) میں محمد بن قاسم نے علاقہ سندھ پر ایک زبردست اور کامیاب حملہ کیا۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ "محمد بن قاسم نواحی سیستان سے سندھ میں داخل ہوا۔ دیبل، بہمنو (بہمن آباد) اور ملتان (ملتان) کو فتح کرتا ہوا شہر قنوج تک جا پہنچا۔ واپسی پر اس نے کشمیر کی حدود کو بھی پے سپر کیا تھا۔" محمد بن قاسم کے اس حملہ آور لشکر میں بے شمار تابعین، تبع تابعین، جلیل القدر محدثین، فضلاء اور اتقیاء شریک ہوئے تھے جن کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ آگے کیا جائے گا۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد اپنے مضمون "اسلام برصغیر پاک و ہند" میں محمد بن قاسمؒ کے ہندوستان پر حملہ، اس کے پس منظر اور اثرات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "برصغیر پاک و ہند میں خورشید اسلام اولاً عین غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافت بنی اُمیہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر اسی برس بیت چکے تھے اور دور خلافت راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اسلام کے صدر اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمین ہند پر "بابُ الاسلام" سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورود اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساس فرض کا مرہون منت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منوّر کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جزر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمد اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔ گویا سرزمین ہند

---

[1] مجمع الزوائد للہیثمی ج ۵ ص ۲۸۲

دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علی منہاج النبوۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار ہوتے تھے۔[1]

ڈاکٹر صاحب کا یہ اقتباس اغلاط کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں کئی تاریخی حقائق اور وقائع کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "برصغیر پاک و ہند میں خورشید اسلام اوّلاً اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر انیس برس بیت چکے تھے اور خلافت راشدہ ..... عرصہ گزر چکا تھا"۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خورشید اسلام کی کرنوں نے ۱۵ھ میں ہی ہندوستان کے بعض علاقوں کو منور کرنا شروع کر دیا تھا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اقتباس بالا کی دوسری خلاف واقعہ بات یہ ہے کہ "اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش ..... داخل ہو چکا تھا"۔ سچ یہ ہے کہ ان مجاہدوں میں صدرِ اول یعنی صحابہ کرام جیسا جوش و خروش اور اسلامی جذبہ و ایثار موجود نہ ہو گا لیکن پھر بھی ان مجاہدین میں تابعین، تبع تابعین و محدثین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن کے اخلاص و جذبہ و ایثار پر اس حد تک شک کرنا کہ "معدوم کے حکم میں داخل" سمجھا جانے لگے کسی طرح روا نہیں ہے۔ اقتباس کا اگلہ جملہ بھی نہایت قابلِ اعتراض ہے کیونکہ سندھ کے راجہ داہر کی مملکت پر محمد بن قاسم کا حملہ صرف "ایک فوری اشتعال کا نتیجہ" نہ تھا بلکہ اس کے پس پشت بھی اشاعتِ اسلام کا جذبہ، "غزوۂ ہند" کے سلسلے میں "افضل الشہداء" اور احراز من النار" والی بشارتیں کارفرما تھیں۔ لہٰذا اس عظیم اسلامی فتح کے متعلق یہ سوئے ظن رکھنا کہ یہ لشکر کشی محض "ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص" کے زیر اثر عمل میں آئی تھی ایک بڑی جسارت ہے۔ تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ فاتح

---

[1] ماہنامہ حکمت قرآن لاہور ج ۷ عدد شمارہ ۲ ص ۳۷ مجریہ ماہ فروری ۱۹۸۰ء

سندھ محمد بن قاسمؒ کے حملہ نے موجودہ پاکستان کے صرف نصف جنوبی "حصہ کو ہی اسلام کے زیر نگیں نہیں کیا بلکہ سندھ کے علاوہ صوبہ پنجاب کے ایک وسیع علاقے کو بھی فتح کیا تھا۔ پھر "برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمد" شمال مغربی علاقوں تک "محدود" ضرور رہی لیکن "عارضی" ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ اہالیان ہند کو "اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات" وفیوض و برکات سے متمتع ہونے کا موقع" ایک طویل زمانہ تک میسر رہا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ محمد بن قاسمؒ کے ہندوستان پر حملے نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کام کو بہت تقویت پہنچائی تھی۔ سندھ و پنجاب کے اکثر شہروں میں درس قرآن و حدیث کے عظیم مراکز و مدارس قائم ہوئے جن میں مساند درس پر وہ جلیل القدر تابعین و تبع تابعین جلوہ افروز ہوئے جنھوں نے معرکۂ ہند میں محمد بن قاسمؒ کے ساتھ بالفعل شرکت کی تھی، چنانچہ مشہور مورخ بلاذری اور سندھ کی قدیم ترین عربی تاریخ "چچ نامہ" کے مؤلف بیان کرتے ہیں:

"محمد بن قاسمؒ نے ۹۳-۹۴ھ میں ہندوستان کے دو مشہور علاقوں یعنی سندھ و پنجاب کو فتح کیا اور وہاں موسیٰ بن یعقوب الثقفیؒ کو باقاعدہ درس حدیث پر مقرر فرمایا۔"

۸۔ ایک اور تابعی، جو محمد بن قاسمؒ کے ساتھ ایک فوجی کی حیثیت سے وارد ہند ہوئے، جہادِ سندھ میں حصہ لیا اور ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و تبلیغ کرتے رہے ان کا نام **ابوشیبہ** یوسف بن ابراھیم التمیمی الجوہریؒ تھا۔ اُن کو حضرت انس بن مالکؓ سے سماع حدیث کا شرف حاصل تھا۔ ابوشیبہ کے درس حدیث میں عمرو بن سلیمان، قرہ بن عیسیٰ، عبد الرحمن بن حسن، عقبہ بن خالد اور مسلم بن عقبہ جیسے عظیم محدثین اور تبع تابعین نے شرکت کی اور اپنے شیخ سے حدیث کی روایت کی۔[1]

۹۔ ایک اور نامور تابعی، جنھوں نے جہاد ہند میں شرکت کی اور معرکۂ سندھ میں محمد بن قاسمؒ کے دست و بازو بنے، کا اسم گرامی زیاد بن الحواری العبدیؒ تھا۔ بعض مؤرخین نے ان کا نام زید بن الحواری العبدی اور بعض نے حواری بن زیاد العبدی بھی لکھا ہے۔ محمد بن قاسمؒ نے جس قافلہ کے ہمراہ راجہ داہر کا سر عراق بھیجا تھا اس قافلہ میں زیاد بن الحواری بھی شریک تھے۔ آپ وہ جلیل القدر تابعی ہیں جنھوں نے حضرت انس بن مالکؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے حدیث روایت کی ہے۔ ابوبشر جعفرؒ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذہبیؒ ج ۴ ص ۴۶۱، تقریب التہذیب لابن حجرؒ ج ۲ ص ۳۷۹، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۴ ص ۳۴۰

اعمش، عبدالملک بن عمیر، سبیعی، محمد بن فضل بن عطیہ، سلام الطویل اور ایوب بن موسیٰ جیسے کبار محدثین نے آپ سے علم حدیث پڑھا تھا۔ امام ابن حبانؒ نے آپ کا ذکر ثقہ راویوں میں کیا ہے۔ سندھ کے مبلغین حدیث میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے[1]

۱۰۔ انہی تابعین میں ایک نامور تابعی زائدہ بن عمیر السطائی الکوفیؒ بھی تھے۔ اُن کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ، ابوہریرہؓ اور نعمان بن بشیر جیسے اکابر صحابہ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ آپ سے حدیث کی روایت کرنے والوں میں محدث ابو اسحاق السبیعی، یونس بن ابی اسحاق اور شعبہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابن سعدؒ نے آپ کو "طبقہ ثالثہ" کے تابعین میں شمار کیا ہے۔ ابن حبانؒ نے آپ کو کتاب "الثقات" میں اور عجلیؒ نے "معرفتہ الثقات" میں ذکر کیا ہے۔ زائدہ بن عمیر السطائی بھی فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسمؒ کے ہمرکاب ہو کر ہندوستان تشریف لائے اور ملتان کی طرف پیش قدمی کے وقت اسلامی لشکر میں شریک تھے۔ سندھ کے نومسلموں میں اسلامی احکام کی تعلیم و اشاعت کی ذمہ داری آپ کے سپرد تھی[2]

۱۱۔ انہی خوش نصیب تابعین میں ایک تابعی ابو قبیس زیاد بن رباح الفیسی البصری بھی تھے جنھوں نے محمد بن قاسم کے دوش بدوش جہاد سندھ میں شرکت کی اور نہایت دلیری و شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ صاحب چچ نامہ بیان کرتے ہیں:

"محمد بن قاسمؒ نے راجہ داہر کا سر اور جہاد سندھ میں تمام حاصل شدہ مال غنیمت جن دو سپاہیوں کی حفاظت میں عراق بھیجا تھا ابو قبیس اس حفاظتی دستہ کے امیر تھے الخ"

ابو قبیسؒ نے حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ حسن بصریؒ وغیرہ نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ امام ابن حبانؒ، عجلیؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ نے اُن کو حدیث کی روایت میں ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "آپ محدثین کے طبقہ ثالثہ سے تعلق رکھتے تھے" آپ کی مرویات سنن نسائی، صحیح مسلمؒ اور سنن ابن ماجہؒ میں وارد ہیں۔ جہاد سندھ کے دوران

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال للذہبیؒ ج ۱ ص ۶۲۲ ثقات لابن حبان [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معرفۃ الثقات للعجلی ج ۱ ص ۳۶۶، الجرح و التعدیل لابن ابی حاتم ج ۳ ص ۶۱۳، تاریخ الکبیر للبخاریؒ ج ۳ ص ۴۳۱، ثقات لابن حبان ج ۴ ص ۲۶۵

ابوقبیسؒ نے تبلیغ اور درس حدیث کا سلسلہ برابر جاری رکھا تھا۔[1]

پس واضح ہوا کہ اس پاک باز گروہ کا ہر فرد نہیں تو کم از کم بیشتر افراد اپنے عمل و کردار سے علم حدیث کے مبلغ ضرور تھے خواہ انھوں نے باقاعدہ مسند درس نہ سنبھالی ہو۔ ان کی زندگی کے ہر گوشہ میں اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی اشاعت کا داعیہ موجزن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں سے متاثر ہو کر اہالیان ہند میں سے بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے اور اللہ و رسول اللہ کے حلقۂ اطاعت میں شامل ہو گئے۔

جب ان اعلیٰ صفات بزرگوں کے علم و فضل بے کراں سے اسلام سے نابلد اللہ کی مخلوق جوق در جوق مسلمان ہونے لگی تو اس اہم و مبارک کام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس دور سعید کے دوسرے علمائے حدیث کو یہ شوق و ولولہ پیدا ہوا کہ بلاد عرب سے اقلیم ہند کی طویل اور پرصعوبت مسافت طے کر کے ہندوستان جائیں اور وہاں دین اسلام کی اشاعت میں پوری یکسوئی کے ساتھ منہمک و مصروف ہو سکیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے حملہ کے بعد بھی متعدد جلیل القدر تابعین و تبع تابعین سرزمین ہند پر جلوہ افروز ہوتے رہے مثال کے طور پر :

۱۲۔ **یزید بن ابو کبشہ الشامیؒ** : جن کے والد کا نام "حیومل" تھا ایک مشہور تابعی تھے۔ آپ حجاج کے زمانہ میں امیر جنگ کے عہدہ پر فائز تھے۔ حجاج بن یوسف کی وفات کے بعد ولید بن عبد الملک نے انھیں بصرہ کے منصب ولایت پر متعین کر دیا تھا۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ بیان کرتے ہیں کہ : "یزید بن کبشہ سلیمان بن عبد الملک کے عہد میں سندھ کے والی خراج تھے اور انہی کے عہد خلافت میں آپ نے وفات پائی تھی"[2] مملکت کے فوجی و انتظامی امور میں سربراہی کے علاوہ آپ وقت کے ایک بلند پایہ محدث بھی تھے۔ آپ نے شرحبیل بن اوس اور حضرت ابوالدرداءؓ وغیرہ سے روایت حدیث کی سعادت پائی تھی۔ ابولبشر، حکم بن عتبہ، معاویہ بن قرہ اور ابراہیم بن عبدالرحمن وغیرہ نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی "صحیح" میں، امام حاکمؒ نے اپنی "مستدرک علی الصحیحین" میں اور امام محمد بن حسنؒ نے کتاب "الآثار" وغیرہ میں ان کی مرویات کی تخریج کی ہے۔ یزید بن ابوکبشہ حالت سفر میں روزہ رکھا کرتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے : معرفۃ الثقات للعجلیؒ ۱ ص۳۰۳، تقریب التہذیب لابن حجر ۱ ص۲۶۷ تہذیب التہذیب لابن حجر ج۳ ص۳۶۶، تحفۃ اللطیفہ للسخاوی ج ۲ ص۸۶ [2] صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۶ ص۱۳۶

ان کے متعلق ایک روایت یوں وارد کی ہے: "فکان یزید یصوم فی السفر" [1] مگر ہشیم عن العوام بن حوشب کی روایت، جس کی تخریج اسمٰعیلیؒ نے کی ہے، میں یہ الفاظ مروی ہیں: "وکان یزید بن ابی کبشہ یصوم الدھر" یعنی یزید بن ابو کبشہ ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔"

۹۶ھ میں یزید بن ابوکبشہ بغرض تبلیغ سندھ تشریف لائے لیکن یہاں آنے کے کچھ دن بعد ہی انتقال فرما گئے تھے۔ مزید تفصیلی حالات کے لیے ثقات لابن حبانؒ، تاریخ الکبیر للبخاریؒ اور فتح الباری لابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۳۔ اسی دور کے ایک تابعی موسیٰ السیلانیؒ تھے جو سندھ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے حضرت انس بن مالکؓ سے حدیث کی سماعت کی تھی اور سندھ کے علاقہ میں ہی علم حدیث کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ حضرت انس بن مالکؓ سے موسیٰ السیلانیؒ کی ملاقات کا ذکر حافظ ابن الصلاحؒ نے اپنے مقدمہ میں اس طرح کیا ہے:

"وروینا عن شعبۃ عن موسیٰ السیلانی واثنی علیہ خیراً قال أتیت انس بن مالک فقلت ھل بقی من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أحد غیرک قال بقی ناس من الأعراب قد رأوہ فأما من صحبہ فلا۔ اسنادہ جید حدث بہ مسلم بحضرتی ابی زرعۃ" [2]

۱۴۔ ایک اور مشہور تابعی سعید بن اسلم بن زرعہ الکلابیؒ تھے جن کا تعلق قبیلہ بنی ربیعہ بن کلاب سے تھا۔ آپ نے اپنے موالی سے حدیث کی روایت کی ہے جو بنی غفار سے تعلق رکھنے والے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ آپ نے باقاعدہ درسِ حدیث بھی دیا ہے۔ بکیر بن الاشج وغیرہ نے آپ سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ ابن ماکولا وغیرہ کا قول ہے کہ سعید بن اسلم خراسان اور سندھ کے والی تھے۔ بعض کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ آپ مکران کے بھی والی تھے اور وہیں آپ نے شہادت پائی تھی۔ جب تک آپ سرزمین مکران و سندھ پر مقیم رہے، درس حدیث کو اپنا اولین مقصد بنائے رکھا۔ مزید حالات کے لیے ثقات لابن حبانؒ اور تاریخ الکبیر للبخاریؒ وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۵۔ اسی کاروان مبلغین کے ایک اور بزرگ تابعی حضرت ابن اُسید بن اخنس الثقفیؒ تھے۔ آپ نے اپنے والد اُسید بن اخنس الثقفیؓ، اپنے چچا مغیرہ بن اخنسؓ اور بعض تابعین سے

---

[1] صحیح بخاری حوالہ مذکور [2] مقدمہ ابن الصلاح مع تقیید والایضاح للعراقی ص ۲۵۲ [3] ترجمہ کے لیے الاصابہ فی تمیز الصحابہ لابن حجر ج ۳ ص ۴۳۱ وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث کی سماعت کی تھی۔ آپ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں سندھ کے والی مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی سندھ کے علاقہ میں اشاعت حدیث کی بہت خدمت انجام دی ہے۔

۱۶۔ اشاعت اسلام کے کاروان میں شامل ایک اور بزرگ تابعی عبدالرحمٰن بن ابوزید البیلمانیؒ تھے۔ آپ کا شمار مشاہیر تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ نے کبار صحابہ میں سے حضرات عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عثمان بن عفان، امیر معاویہ، سعید بن زید، عمرو بن اوس، عمرو بن عصیہ وغیرہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے نافع بن جبیر اور عبدالرحمٰن الاعرج وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ آپ کے دروس حدیث سے فیضیاب ہونے والے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے زید بن اسلم، سماک بن فضل، ربیعہ بن ابوعبدالرحمٰن، خالد بن ابوعمران، یزید بن طلق اور آپ کے صاحبزادہ محمد بن عبدالرحمٰن البیلمانیؒ نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ شیخین کے علاوہ دوسرے ائمہ حدیث مثلاً امام ترمذی اور امام نسائیؒ وغیرہ نے آپ کی روایات کی تخریج کی ہے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ "آپ کبار شعراء میں سے تھے"

عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی اصلاً یمن کے رہنے والے تھے اور حضرت عمر کے عہد خلافت میں ایک غلام کی حیثیت سے مدینہ لائے گئے تھے۔ بعد میں آپ نے "بیلمان" نامی مقام پر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اسی نسبت سے آپ کو بیلمانی کہا جانے لگا۔ "بیلمان" سندھ اور گجرات کے علاقہ کاٹھیاواڑ کے درمیان واقع ایک قصبہ ہے جس کا اصل نام "بھیلمان" ہے، عرب مؤرخین نے "بھیلمان" کی تعریب میں اس کو "بیلمان" کر دیا ہے۔ بھیلمان کے گرد و نواح کو عبدالرحمٰن بن ابوزیدؒ نے ایک عرصہ دراز تک اپنے دروس حدیث سے فیضیاب کیا۔[1]

اب چند اتباع تابعین کے اسمائے گرامی اور ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

۱۔ اس کاروان کے ایک بزرگ اسرائیل بن موسیٰ البصری تھے۔ آپ ہندوستان میں علم حدیث کا درس دینے کی ہی غرض سے تشریف لائے اور ایک عرصہ دراز تک سندھ میں درس دیتے رہے۔ آپ کو امام حسن بصریؒ، ابوحازم اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حسین الجعفیؒ اور یحییٰ القطانؒ جیسے کبار محدثین نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ صحیح بخاریؒ، سنن ابوداؤدؒ، جامع ترمذیؒ اور سنن نسائیؒ میں آپ کی روایات موجود ہیں۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے آپ کو محدثین کے طبقہ ششم کے ثقات میں شمار کیا ہے اور "نزیل الہند" لکھا ہے مگر علامہ ذہبیؒ نے مزید

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح الباری لابن حجر ج ۱۲ ص ۲۶۲، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۴۴۷، میزان الاعتدال للذہبی ج ۲ ص ۵۵۱، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۲ ص ۱۱۸ ثقات لابن حبان

صراحت فرماتے ہوئے آپ کو "نزیل السند" لکھا ہے۔[1]

۲۔ اس جماعت کے دوسرے بزرگ ابوسلیمان ایوب بن یزید بن قیس بن زرارہؒ تھے۔ بعض لوگوں نے انھیں ابن ابی یزید بھی لکھا ہے۔ بعض مشہور تابعین سے آپ کو حدیث کی سماعت کا شرف حاصل تھا۔ آپ ایک عظیم المرتبت خطیب، ممتاز محدّث اور ادیب تھے، فصاحت و بلاغت میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حجاج بن یوسف کے دور میں آپ نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں بالخصوص پنجاب، سندھ اور مکران وغیرہ کی خوب سیاحت کی اور جہاں جہاں آپ نے قیام کیا وہاں کے لوگوں کو اپنے اخلاق و اعمال و کردار اور وسعت علم سے متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا۔ ۸۴ھ میں حجاج بن یوسف نے اُن کو قتل کروا دیا تھا۔[2]

۳۔ اسی قافلۂ محدثین کے ایک اور بزرگ جنھوں نے سرزمین ہند کو اپنے ورود سے سرفراز فرمایا ابومحمد رجاء بن السندیؒ تھے۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے "تقریب التہذیب" میں انھیں ابومحمد رجاء "السدی" لکھا ہے مگر "تہذیب التہذیب" میں انہی بزرگ کا نام "ابومحمد رجاء بن السندی" لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے، واللہ اعلم۔ سندھ میں آکر مستقل سکونت اختیار کر لینے کے باعث ہی آپ "السندی" کہلائے۔ صحیح بخاری میں آپ کی مرویات موجود ہیں۔ علامہ ابن حجر نے آپ کو طبقہ دہم کے "صدوق" محدثین میں شمار کیا ہے۔ سرزمین سندھ میں آپ نے حدیث کی جو خدمت انجام دی اس کی تفصیل کتب میں موجود ہے۔

۴۔ اس سعید جماعت کے ایک بزرگ عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی کے فرزند محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانیؒ بھی تھے جنھوں نے اپنے والد کے بعد سندھ کی مسند درس سنبھالی تھی۔ آپ نے اپنے والد عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں صالح بن عبدالجبار حضرمی اور محمد بن حارث الحارثی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی اپنے وقت کے ایک نامور محدث تھے، سنن ابن ماجہؒ اور سنن ابوداؤدؒ میں آپ سے مروی احادیث موجود ہیں۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے آپ کو محدثین کے طبقہ ہفتم میں شمار کیا ہے۔ بعض ائمہ جرح و تعدیل نے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۶۴، میزان الاعتدال للذہبی ج ۱ ص ۲۰۸، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۳ ص ۲۴۳، فتح الباری لابن حجر ج ۱۳ ص ۶۵ [2] تفصیل کے لیے دیکھئے، میزان الاعتدال للذہبی ج ۱ ص ۲۹۵، الضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۱ ص ۱۳۴ [3] تقریب التہذیب لابن حجر عسقلانی ج ۱ ص ۲۴۸

آپ کو ضعفاء میں شمار کیا ہے۔[1]

(۵) ہندوستان تشریف لانے والے ایک اور بزرگ محدث ربیع بن صبیح السعدی البصریؒ تھے۔ آپ خلیفہ مہدی عباسی کے عہد میں بغرض اشاعت اسلام ہندوستان آئے اور مستقلاً یہیں بس گئے۔ رامہرمزیؒ کا قول ہے کہ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حدیث کے موضوع پر پہلی مبوب کتاب تصنیف فرمائی تھی"۔ آپ کو امام حسن بصریؒ، مجاہد اور یزید الرقاشیؒ وغیرہ سے سماعت حدیث کا شرف حاصل تھا۔ آپ سے حدیث روایت کرنے والوں میں ابن مہدی، عاصم بن علی، آدم اور علی بن الجور جیسے کبار محدثین شامل ہیں۔ امام بخاریؒ نے معلقاً اور امام ترمذیؒ و ابن ماجہؒ نے آپ سے مروی احادیث کو قبول کیا ہے۔ شعبہؒ کا قول ہے کہ "آپ سادات المسلمین میں سے تھے"۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے انھیں محدثین کے طبقہ سابعہ میں شمار کیا ہے۔

اگرچہ ہندوستان میں آپ کی آمد کا مقصد درس و تدریس تھا لیکن آپ نے یہاں غزوۂ ہند (فتح اربد) میں شرکت کی تھی۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "کان رجلا غزاء" آپ نے ۱۶۰ھ میں انتقال فرمایا اور سندھ ہی میں مدفون ہوئے۔[2]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال للذہبی ج ۳ ص ۶۱۷، الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۳ ص ۳۱۱، مجروحین لابن حبان ج ۲ ص ۲۶۴، کامل فی الضعفاء لابن عدی ج ۳ ص ۲۱۸۵، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۱۸۲، الکشف الحثیث للحلبی ص ۳۸۶، الضعفاء والمتروکون للنسائی ترجمہ ۵۲۶، الضعفاء والمتروکون للدارقطنی ترجمہ ۴۵۲، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۱ ص ۱۶۳، تاریخ الصغیر للبخاری ج ۲ ص ۱۹، ضعفاء الصغیر للبخاری ترجمہ ۳۲۹، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ص ۱۰۱ [2] تفصیل کے لیے تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۲۴۵، میزان الاعتدال للذہبی ج ۳ ص ۴۱، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۴ ص ۸۲ تاریخ الخلفاء اور ابجد العلوم للنواب صدیق حسن خاں ملاحظہ فرمائیں۔

عہدِ نبویؐ کے غزوات و سرایا

ڈاکٹر رؤف اقبال صاحبہ نے اس تصنیف میں اسلام کے نظریہ جہاد پر اسلامی موقف کی بے لاگ ترجمانی کی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے۔

اڈیشن کی طباعت۔ صفحات ۲۴۷ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

... AHMED SHERIFF
... RAPPA THOTA
... AM BA...

بحث ونظر

نسخ فی القرآن کا مسئلہ

مولانا ابراہیم عادل

قرآن مجید کے تعلق سے ناسخ منسوخ کے موضوع پر متقدمین اور متاخرین کی درجنوں سے اوپر نہایت اہم تصانیف موجود ہیں، نیز سینکڑوں سے متجاوز مختصر ومطوّل مقالات مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں، لیکن اس کے باوجود موضوع پر ابھی لکھنے کی بہت گنجائش ہے۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس بحث میں علماء کی تین جماعتیں ہوگئی ہیں ایک جماعت وہ ہے جس کے یہاں اثبات نسخ میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض ایسی آیات بھی منسوخات کی فہرست میں داخل کردی گئی ہیں جن کی حیثیت دین میں اصول کی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جو قرآن مجید میں نسخ کے وقوع کا یک قلم منکر ہے اور ان آیات کو جن میں نسخ واقع ہوا ہے تاویلات باردہ کی خراد پر چڑھاتا ہے، ہمارے نزدیک یہ دونوں جماعتیں اس بحث میں صحیح راستہ سے ہٹ گئی ہیں، تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان نقطۂ اعتدال پر ہے، اگرچہ اس نظریہ کے حامل حضرات کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد میں اتفاق نہیں ہے، ابن العربی مالکی اور جلال الدین سیوطیؒ جیسے حضرات کے نزدیک تقریباً بیس آیات منسوخ ہیں جبکہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے رسالے الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں فقط پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کیا ہے اور باقی آیات کی توجیہ کردی ہے، شاہ صاحبؒ نے جن پانچ آیات میں نسخ تسلیم کیا ہے ہمارے نزدیک ان میں سے فقط ایک آیت وصیت منسوخ ہے اور دو آیتیں جو شاہ صاحبؒ کے نزدیک منسوخ نہیں ہیں اور ہمارے نزدیک ان میں قطعی طور پر نسخ ثابت ہے سورۂ نساء کے رکوع سوم کی بالکل ابتداء میں علی الترتیب واقع ہیں ہمارے نزدیک فقط یہ تین آیتیں ایسی ہیں جن میں قطعی طور پر نسخ واقع ہوا ہے ان تین آیتوں کے سوا اور کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں اس معنی میں نسخ واقع ہوا ہو کہ منسوخ حکم پر عمل کرنا غلط ہوگیا ہو، احقر نے ایسی آیات پر جن کی تعداد کم وبیش سترہ ہے ایک الگ مضمون میں بحث کی ہے اور اشکالات

کو رفع کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اس مضمون میں ہمیں اقسام نسخ پر بحث کرنی ہے۔ نیز جو غلط نظریے اقسام نسخ کے سلسلے میں اہلِ علم کے بعض حلقوں میں روایتی طور پر پھیلے ہوئے ہیں ان کی پوری تردید بھی اس مقالہ کا موضوع ہے۔ علماء کرام نے عام طور پر قرآن مجید کی منسوخ آیتوں کی تین قسمیں فرمائی ہیں (۱) منسوخ التلاوۃ والحکم (۲) منسوخ التلاوۃ دون الحکم (۳) منسوخ الحکم دون التلاوۃ۔ پہلی دونوں قسمیں ہمارے نزدیک دراصل تہ بہ تہ مغالطوں کی پیداوار ہیں جن کی کوئی بنیاد ہی سرے سے نہیں ہے۔

نسخ کے اثبات میں سورۂ بقرہ کی اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے:

ما ننسخ من اٰیۃ اَوْ نُنسھا نات	جس آیت کو ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلاتے
بخیر منھا اَوْ مثلھا۔	ہیں تو اس سے بہتر یا اُسی جیسی دوسری
(البقرۃ ۱۰۶)	لے آتے ہیں"

اس آیت میں تین لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں، نسخ، اٰیۃ، انساء، ذیل کی سطور میں ہم ان الفاظ کی تحلیل کرتے ہیں

نَسَخَ یَنْسَخُ فتح یفتح سے آتا ہے اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں مٹانا ختم کرنا، ہٹانا، چنانچہ یہ معنی قرآن مجید میں بھی استعمال ہوئے ہیں:

فینسخ اللہ ما یُلقی الشیطان	جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے
(الحج ۵۲)	اللہ ان کو مٹا دیتا ہے۔

نیز کہا جاتا ہے:

نسخت الشمس الظل	دھوپ نے سایہ کو ختم کر دیا

اسی مناسبت سے تحویل تبدیل تغیر نقل وغیرہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، دوسرا قابلِ غور لفظ "آیۃ" ہے، اس لفظ کے اوپر مولانا مودودیؒ کا نوٹ ملاحظہ فرمائیے:

"آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہے۔ کہیں آثار کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے۔ کیونکہ مظاہر فطرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔ کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے

جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے کیونکہ یہ معجزات دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیوں کہ وہ نہ صرف حق وصداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے اس کے محض مضامین ہی میں نہیں اس کے الفاظ اور انداز بیان اور طرز عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ہر جگہ عبارت کے سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہوجاتا ہے کہ کہاں آیت کا لفظ کس معنی میں آیا ہے [1]

کتاب اللہ کے فقروں کو بھی "آیات" کہا گیا ہے عام اس سے کہ وہ کس چیز پر مشتمل ہیں۔ انھیں قرآنی فقروں میں وہ فقرے بھی شامل ہیں جو اللہ کی طرف سے ایجابی یا سلبی نوعیت کے احکام پر مشتمل ہوتے ہیں۔ زیر بحث آیات میں قرینہ بتاتا ہے کہ یہاں وہ فقرے مراد لئے گئے ہیں جو احکام پر مشتمل ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید نے جس طرح قرآنی فقروں کو "آیات" کہا ہے، اسی طرح سابقہ کتابوں کے فقرات کے لیے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ زیر بحث آیات میں چونکہ یہ لفظ نکرہ ہے اس لیے قرآن مجید اور سابقہ آسمانی کتابیں بھی اس میں شامل ہیں۔ لہذا وہ لوگ غلطی پر ہیں جو یہاں اس لفظ کو فقط قرآن مجید یا فقط سابقہ آسمانی کتابوں کے لیے ہی خاص کرتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں "آیت" سے مراد احکام پر مشتمل فقرات ہیں عام اس سے کہ وہ قرآن مجید میں واقع ہوئے ہوں یا سابقہ کتابوں میں۔

تیسرا لفظ جو قابل توجہ ہے "انساء" ہے، یہ باب افعال سے مصدر ہے، اس کے معنی ہیں بھلانا، نظر انداز کرنا۔ یہ بھلانا اور نظر انداز کرنا ہے کیا؟ اس اہم سوال کے جواب میں ہمارے ہاں کی درس گاہوں اور دینی تعلیم گاہوں میں بعض روایتیں پیش کی جاتی ہیں جن کا غلط ہونا بالکل واضح ہے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ چیزیں بعض قابل اعتبار کتابوں تک میں موجود ہیں، اگرچہ ان کتابوں میں ان واہیات اور خرافات کا وجود محض غلط فہمیوں کا پیدا کردہ ہے لیکن بعد کو ان مغالطوں کو علمی اور نظریاتی حیثیت دے کر متفق علیہ مسئلے کی شکل دیدی گئی۔

لیکن ان روایات پر جب اصول کی روشنی میں نقد کیا جاتا ہے تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسی تمام روایتیں یک قلم مردود ہیں۔ ان روایات و آثار میں جو بات قدر مشترک کے طور پر پائی

جاتی ہے وہ کچھ ایسا تصور ہے کہ بعض مرتبہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کوئی آیتہ یا سورۃ لوگوں کو سکھائی لیکن من جانب اللہ بعض وجوہ کی بنا پر لوگوں کی قوت حافظہ پر نسیان طاری کر دیا گیا اور وہ آیت یا سورۃ لوگوں کے حافظہ سے محو کر دی گئی۔ اگرچہ ایسا ہونا کوئی امر محال نہ تھا لیکن بہرحال کسی شے کے وجود کے امکان سے ہی اس کا وجود لازمی نہیں ہو جاتا تا آنکہ خارج سے کوئی دلیل اس کے وجود پر قائم نہ ہو جائے۔ لیکن زیر بحث مسئلہ میں بعض روایات تو محض ایجاد کردہ ہیں جس سے قرآن کی شان بہت بلند ہے اور بعض روایات اگرچہ درست ہیں لیکن غلط فہمی سے ان کا مطلب بگاڑ لیا گیا ہے۔ بطور نمونہ کے ہم ایک دو روایات کا ذکر کرتے ہیں۔

و اخرج الطبرانی فی الکبیر عن ابن عمر قال قرأ رجلان سورۃ اقرءھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکانا یقرآن بھا فقاما ذات لیلۃ یصلیان فلم یقدرا منھا علی حرف فاصبحا غادیین الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرا ذالک لہ فقال انھا مما نُسخ تلاوتہ فالھوا عنھا [1]	"طبرانی نے اپنی کتاب الکبیر میں تخریج کی ہے کہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ دو صحابیان نے ایک سورۃ پڑھی جسے اللہ کے رسولؐ نے انھیں پڑھایا تھا وہ دونوں اسے پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات کو وہ نماز کے لیے جو کھڑے ہوئے تو انھیں اس "سورۃ" کا ایک حرف بھی یاد نہیں آیا اور یہ نہ پڑھ سکے۔ صبح کو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس "حادثہ" کی آپ کو اطلاع دی تو آپؐ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ وہ 'سورۃ' منسوخ شدہ چیزوں میں سے ہے لہذا اس کی طرف توجہ نہ کرو"

اس روایت میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان دونوں آدمیوں کو جو سورہ سکھائی گئی تھی اس کی قرآنیت کا ادنیٰ اشارہ بھی اس روایت میں نہیں ہے، لیکن نہ جانے کیونکر انھیں قرآن سمجھ لیا گیا۔

اس روایت کی سند اگیا قیمت ہے! اس بحث میں پڑنا بالکل غیر ضروری ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ کوئی آیت یا سورۃ ایسی بھی ہے جو اللہ کے رسول نے فقط دو آدمیوں کو ہی پڑھائی ہو؟ اور باقی لوگ اس سے محروم رکھے گئے ہوں! اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہی ہے تو آخر اس روایت کا کیا مطلب ہے؟ جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ

"سورۃ" فقط ان دو حضرات کو سکھائی گئی تھی جنھیں نسیان کا مذکورہ حادثہ پیش آیا ورنہ اگر اس سورۃ کی تعلیم میں سارے مسلمان شریک ہوتے تو نسیان کا حادثہ بھی سب ہی کو پیش آتا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حادثہ پیش آتا۔ لیکن روایت میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے راوی نے ابن عمر کی بات کو پوری طرح نہیں سمجھا جس کی وجہ سے صحیح الفاظ میں وہ واقعہ کی تعبیر نہ کر سکا اور خلق خدا کو قرآن مجید کے متعلق غلط فہمیوں میں لاشعوری طور پر مبتلا کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو حضرات کو کسی وجہ سے کوئی دُعا سکھائی، کام پورا ہو جانے کے بعد وہ لوگ بھول گئے۔ اللہ کے رسول نے بتایا کہ وہ سورۃ اسی لیے تھی کہ بعد میں بھلا دی جائے لہٰذا اس کا خیال نہ کرو۔ شاید بعد کے لوگوں کو مغالطہ سورۃ کے لفظ سے ہوا ہے۔ کاش یہ حضرات غور کرتے کہ "روایات" میں بعض دعاؤں کو مثلاً دعائے قنوت کو بھی "سورۃ" کہہ دیا گیا ہے حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ دعائے قنوت وغیرہ کبھی قرآن نہ تھیں۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی روایات ذخیرہ کتب میں ملتی ہیں جن میں بعض تو یقیناً وضاعین حدیث کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں، اور بعض روایات اگرچہ موضوع نہیں ہیں لیکن ان کا مقصد متعین نہ ہو سکا جس کا انجام یہ ہوا کہ منسوخات کی سہ گانہ تقسیم کی گئی اور بڑے طنطنہ کے ساتھ اس قسم کی برخود غلط "روایات" میں مذکور عبارات کو قرآن قرار دیا گیا اور پھر قرآن مجید میں موجود نہ پا کر ان عبارات کے متعلق یہ نظریہ ایجاد کر لیا گیا کہ یہ عبارتیں، قرآن کی ایسی آیات ہیں جو حکم اور الفاظ سمیت اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دی ہیں، رفتہ رفتہ یہ برخود غلط نظریہ ایک علمی مسلمہ کی شکل اختیار کر گیا، جبکہ اس قسم کی تمام چیزیں احکام کے بجائے اخبار پر مشتمل ہیں اور اخبار میں نسخ نہیں ہوتا۔

علم الٰہی میں جو احکام مؤقت ہوتے ہیں ان کا وقت پورا ہو جانے پر انھیں دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کے ذریعہ ختم کر دیا جاتا ہے، ان دونوں طریقوں کے نام نسخ اور انساء ہیں۔ نسخ اس صورت کو کہا جاتا ہے کہ "حکم" کے الفاظ اور اس کی عبارت باقی رکھی جائے لیکن اس عبارت سے نکلنے والے حکم کو کوئی دوسرا حکم آکر ختم کر دے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مؤقت حکم کے بدلے میں کوئی دوسرا حکم نہ آئے بلکہ براہِ راست پہلے حکم کا نام لے کر اسے ختم کر دیا جائے۔ یہ ساری شکلیں لفظ نسخ کے حدود میں داخل ہیں۔ اور انساء کا اطلاق ایسی صورت میں ہوتا ہے کہ حکم کے ساتھ اس کی عبارت بھی واپس لے لی جائے۔ اس طرح گویا پہلے حکم سے مکمل طور پر نظر ہٹانا اور اسے بالکلیہ ختم کرنا منظور ہوتا ہے، جبکہ پہلی شکل میں بعض عظیم تر مصالح کے تحت حکم کو ختم کر کے اس کے الفاظ اور عبارت کو باقی رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک متعین طور پر قرآن مجید میں نسخ و انساء کے وقوع کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں جہاں

تک سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے فقط امکان ہی ظاہر ہوتا ہے، باقی رہا تعیین کے ساتھ کسی آیت میں نسخ وانسار کے وقوع کا معاملہ تو وہ فقط اسی صورت میں قابلِ تسلیم ہے کہ جب دو احکامی آیتوں میں صریح تعارض پایا جائے کہ دونوں میں سے ایک کا ترک ناگزیر ہو جائے۔ اگر یہ صورت پیش آجائے تو مقدم کو منسوخ مان کر مؤخر کو اس کے لیے ناسخ تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور اگر منسوخ حکم کے بدلے میں کوئی دوسرا حکم نہیں آیا ہے تو پھر جس حکم کو منسوخ کیا جا رہا ہے اُسے منسوخ ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اس حکم کی عبارت کے ہم پلہ و ہم مرتبہ کوئی چیز اسے واضح الفاظ میں منسوخ ٹھہرائے جو ہماری تحقیق کے مطابق قرآن کے لیے فقط قرآن ہی ہو سکتا ہے دوسری کوئی چیز یہ حق نہیں رکھتی۔ متقدمین علماء نے تو قرآن کی تقریباً پانچ سو[۵] آیات کو منسوخ قرار دیا تھا لیکن بعد کو یہ تعداد برابر گھٹتی رہی۔ متقدمین اور متاخرین کے اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں تھا کہ متقدمین پر قرآن کی زیر بحث آیات کے وہ معانی منکشف نہیں ہوئے تھے جن سے متاخرین بہرہ ور ہوئے! بلکہ اس اختلاف کی وجہ "نسخ" کے حقیقی معنی اور مراد کی تعیین تھی۔ متقدمین نے دو مختلف حکموں میں ظاہری اور بسا اوقات بالکل غیر متعلق اختلاف کی بھی توجیہ کی زحمت گوارا انہیں فرمائی۔ ورنہ جو کاوش انھوں نے مختلف احادیث کے محامل بیان کرنے میں اٹھائی تھی اگر اس کاوش کا نصف حصہ بھی وہ بظاہر قرآن کی مختلف آیتوں کی توجیہ اور اُن کے محامل بیان کرنے میں صرف کر دیتے تو شاید ان کے یہاں منسوخ آیات کے سلسلے میں جو عظیم الشان بے اعتدالی پائی جاتی ہے اس کا وجود نہ ہوتا۔ ہمارے نزدیک منسوخ حکم فقط وہ کہلائے گا جس پر عمل کرنا بالکل غلط اور خلاف دین ہو گیا ہو، ورنہ اگر پہلے حکم پر استحباب کی حد تک بھی عمل درآمد کی گنجائش ہوتی تو اس حکم کو منسوخ نہیں کہا جائے گا، اور یہ بات ہم نسخ کے اصلی معنی کو پیشِ نظر رکھ کر کہہ رہے ہیں، اور اس طرح سے ہمارے نزدیک قرآن مجید میں فقط تین آیتیں منسوخ ہیں۔

بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن مجید میں منسوخ آیات تو موجود ہیں (اگرچہ بہت ہی کم ہیں) لیکن قرآن کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو کو بھی اللہ نے نازل فرما کر واپس نہیں لیا ہے، قرآن کی شان اس سے بلند ہے کہ اس کے کسی ادنیٰ جزء کے بارے میں بھی انساء (بھلا دئے جانے) کا تصور کیا جائے۔[۵]

نسخ کی اقسام ثلٰثہ پر تفصیلی گفتگو

عام طور پر علماء منسوخ آیات کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں (۱) منسوخ التلاوۃ مع الحکم (۲) منسوخ التلاوۃ دون الحکم (۳) منسوخ الحکم دون التلاوۃ۔

ہم ان تینوں قسموں پر علی الترتیب مختصر گفتگو کریں گے۔

پہلی قسم پر بحث

پہلی قسم یعنی منسوخ التلاوۃ مع الحکم کے سلسلے میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں ان کی دو[2] قسمیں ہیں۔ کچھ روایات تو ایسی ہیں جن میں فقط یہ بیان ہوا ہے کہ فلاں سورۃ میں دراصل اتنی اور اتنی آیتیں تھیں لیکن بعد میں صرف اُتنی باقی رہ گئیں جتنی کہ اب موجود ہیں اور کچھ روایات ایسی ہیں جن میں بعض عبارات تک کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے کہ یہ عبارتیں دراصل قرآن کی منسوخ شدہ عبارتیں ہیں۔ ان میں سے قسم اوّل کی چند روایات ہم علوم القرآن پر مشہور تالیف الاتقان فی علوم القرآن (جو دراصل صاحب تصنیف شیخ جلال الدین السیوطیؒ کی تفسیر مجمع البحرین کا مقدمہ ہے) سے نقل کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

قال ابوعبید حدثنا اسمٰعیل بن ابراھیم عن ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال لیقولنّ احدکم قد اخذتُ القرآن کُلّہٗ وما یدریہ ما کُلّہ قد ذھب منہ قرآن کثیر ولکن لیقل قد اخذتُ منہٗ ما ظھر[3]	ابوعبید کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیل بن ابراہیم نے بیان کیا کہ ایوب نافع سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ تم میں سے ایک آدمی کہتا ہے کہ میں نے سارا قرآن حاصل کر لیا حالانکہ اسے پتہ نہیں کہ پورا قرآن کتنا ہے، اس میں سے بہت سا قرآن کا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ لیکن اُسے یہ کہنا چاہیے کہ قرآن کا وہ حصہ میں نے حاصل کیا ہے جو ظاہر ہے اور موجود ہے۔

اس روایت کے متعلق یہ تحقیق کہ علماء رجال نے کن راویوں پر کلام کیا ہے کن راویوں کی توثیق کی ہے ہمارے نزدیک فضول عمل ہے اس لیے کہ اس طرح کی روایتوں کے راوی اگر علماء رجال کے نزدیک ہر فتنے سے محفوظ اور بالکل ثقہ بھی ہوں (اگرچہ فی الواقع ایسا ہو نہیں سکتا) تو بھی یہ اور اس جیسی تمام روایتیں اسی کی مستحق ہیں کہ انھیں رد کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اگر کوئی باطل چیز بزرگوں کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ غلط چیز مقدس نہیں ہو جائے گی البتہ اگر نسبت درست ثابت ہو جائے تو بزرگوں کا تقدس ضرور خطرے میں پڑ جائے گا! یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس

روایت کی ابن عمرؓ کی جانب نسبت کسی زندیق نے ہی کی ہے۔ مزید روایت ملاحظہ فرمائیے:

وقال حدثنا ابن ابی مریم عن ابن لهیعة عن ابی الاسود عن عروة بن الزبیرؓ عن عائشةؓ قالت کانت سورة الاحزاب تقرأ فی زمن النبی صلی الله علیه وسلم مائتی آیة فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منها الا ما هو الآن ۔

اور ابو عبید کہتے ہیں کہ ہم سے ابن ابی مریم نے بیان کیا کہ ابن لہیعۃ ابوالاسود سے اور وہ عروہ ابن الزبیرؓ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورۂ احزاب کی دو سو آیتیں پڑھی جاتی تھیں لیکن حضرت عثمان نے جب مصاحف کی کتابت کرائی تو اس کے بعد سے بس اتنی ہی آیتیں باقی رہ گئیں جو اب موجود ہیں۔

اس روایت کے ماحصل کو ذرا ذہن میں رکھیے:

وقال حدثنا اسمٰعیل ابن جعفر عن المبارک بن فضالة عن عاصم بن ابی النجود عن ذر بن حبیش قال لی ابن ابن کعبؓ کاین تعد سورة الاحزاب؟ قلت اثنتین وسبعین آیة او ثلثة وسبعین آیة قال ان کانت لتعدل سورة البقرة وان کنا لنقرؤ فیها آیة الرجم قلت وما آیة الرجم؟ قال اذا زنا الشیخ والشیخة فارجموهما البتة نکالا من الله والله عزیز حکیم ۔

اور ابو عبید فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیل بن جعفر نے بیان کیا کہ وہ مبارک بن فضالہ سے اور وہ عاصم بن ابی النجود سے اور وہ ذر بن حبیش سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی کعبؓ نے کہا کہ سورۂ احزاب کی کتنی آیتیں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ بہتر یا تہتر آیتیں ہیں تو ابن ابی کعب نے فرمایا کہ یہ سورۃ پہلے سورۂ بقرہ کے برابر تھی اور ہم اس سورۃ میں رجم کی آیت بھی پڑھتے تھے میں نے کہا کہ یہ آیۃ الرجم کیا چیز ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ الشیخ والشیخۃ الخ کہ بوڑھا اور بوڑھی جب

زنا کریں تو انھیں سنگسار کر ڈالو"

وقال حدثنا عبد الله بن صالح عن الليث عن خالد بن يزيد عن سعيد بن ابی هلال عن مروان بن عثمان عن ابی امامة بن سهل ان خالته، قالت لقد اقرأنا رسول الله صلى الله عليه وسلم آية الرجم الشيخ والشيخة فارجموهما البتة بما قضيا من اللذة۔

اور ابو عبید نے کہا کہ ہمیں عبداللہ بن صالح نے خبر دی کہ لیث خالد بن یزید سے اور وہ سعید بن ابی ہلال سے اور وہ مروان بن عثمان سے اور وہ ابوامامہ بن سہل سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی خالہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں "آیۃ الرجم" پڑھائی جس کے الفاظ یہ ہیں" الشیخ و الشیخۃ فارجموھما البتۃ بما قضیا من اللذۃ۔ یعنی بوڑھے اور بوڑھی کو سنگسار کر ڈالو اس لیے کہ انھوں نے لذت حاصل کی ہے۔

وقال حدثنا حجاج عن ابی جريج اخبرنی ابن ابی حميد عن حميدة بنت ابی يونس قالت قرأ علی ابی وهو ابن ثمانين سنة فی مصحف عائشة ان الله وملئكته يصلون على النبی يا ايها الذين امنوا صلوا عليه وسلموا تسليما وعلى الذين يصلون الصفوف الاول قالت قبل ان يغير عثمان المصاحف۔

ترجمہ: ابو عبید کہتے ہیں کہ ہم سے حجاج نے ابو جریج کے واسطے سے یہ روایت بیان کی کہ ان کو (ابو جریج کو) ابن ابی حمید نے حمیدۃ بنت ابی یونس کے حوالہ سے بتایا کہ حمیدہ کو ان کے والد نے اسّی سال کی عمر میں مصحف عائشہ سے یہ حصہ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا یھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما وعلی الذین یصلون الصفوف الاول پڑھ کر سنایا۔ حمیدہ کہتی ہیں کہ یہ واقعہ مصاحف کے سلسلہ میں حضرت عثمان

کی تبدیلیوں سے پہلے کا ہے۔

نمونہ کے بطور پانچ روایتیں یہاں لکھ دی ہیں، پہلی بات تو یہ یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس قسم کی کوئی روایت اگر سنداً درست اور علت سے خالی نکل آئے تو اس کا مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ روایت کے متن میں اگر چہ کتنی ہی خرابیاں کیوں نہ ہوں تب بھی محض سند کی بنا پر ہی اس روایت کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے گا اس لیے کہ روایت میں سند کی حیثیت کتنی ہی اہمیت کی حامل کیوں نہ ہو تاہم متن سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا اور اس میں غلطیوں کا بہر حال پورا امکان ہے لیکن یہ امکان جب واقعہ کی شکل اختیار کر جائے تو پھر اس قسم کی روایت کو کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس کی حفاظت کا وعدہ براہ راست اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ صادق القول کون ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ وعدہ قیامت تک کے لیے ہی ہے۔ اب اگر کوئی روایت یا چند روایتیں ایسی ہوں جو قرآن مجید میں تحریف کے وقوع کو ظاہر کریں تو کیا ان روایات کو محض اس بنیاد پر صحیح مان لیا جائے گا کہ اُن کے رُواۃ ثقہ ہیں اور 'حاکم' نے اور فلاں فلاں محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، درانحالیکہ اَن روایات کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں وعدہ الٰہی کی تکذیب لازم آرہی ہے پھر اگر کوئی شخص ان روایتوں کو درست مانتا ہے تو وہ سخت خطاوار ہے اور اس نے روایت کو وہ اصل مقام دیدیا ہے جس کا مستحق فقط قرآن مجید ہے اور اس نے روایت کو قرآن کے اوپر کسوٹی کا درجہ دے دیا ہے درانحالیکہ یہ مقام اللہ تعالیٰ نے فقط قرآن مجید کو ہی دیا ہے، ہماری اس گذارش پر نظر کرتے ہوئے اب آپ ذرا ان روایات پر تدبر کی ایک نگاہ ڈالیے۔ پہلی روایت پر ہم تبصرہ کر چکے ہیں، دوسری روایت جو عروۃ بن الزبیر کے واسطے سے حضرت عائشہ صدیقہ سے نقل ہوئی ہے اس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سورۂ احزاب میں حضرت عثمان کی کتابت مصاحف سے قبل دو سو آیات تھیں جس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے سورۂ احزاب کی تقریباً دو تہائی آیتیں ختم کر ڈالیں اور مزید لطف یہ ہوا کہ حضرت عثمان کے اس اقدام پر کسی بھی صحابیؓ رسول حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ نے بھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا بلکہ بہت سے لوگوں نے ان کی اس کام میں مدد کی اور ان کا ہاتھ بٹایا نعوذ باللہ من الروایات الضالۃ ــــ یاد رکھئے کہ قرآن مجید کی حقانیت اور اس کی محفوظیت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مقام اس دُنیا کے گنے چُنے حقائق میں سرفہرست ہے، بعض لوگ اگر اس کے تعلق سے مغالطوں کا شکار ہو گئے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ان کے اوپر ہے قرآن کی محفوظیت اور قطعیت اس سے ہرگز متاثر نہیں ہوگی، اس دنیا کا نظام ہی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ یہاں بعض لوگوں

کو بدیہی حقائق میں بھی مغالطے پیش آجاتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے مغالطوں سے حقیقت کا چہرہ بے نور نہیں کیا جا سکتا البتہ اس طرح کے لوگوں کی مریضانہ ذہنیت سامنے آکر یہ بات ضرور سمجھ میں آجاتی ہے کہ دُنیا میں بلند سے بلند اور واضح سے واضح تر حقیقت کے متعلق بھی شکوک پیدا کرنے والے اور ان شکوک و مغالطات کا شکار ہو جانے والے برابر موجود رہتے ہیں، لیکن یہ بات بھی ضرور یاد رہے کہ اس قسم کی دانستہ یا نادانستہ کوششیں حقیقت کے آفتاب عالمتاب کو اپنے گرد و غبار کے پردوں میں چھپا نہیں سکتیں۔

تیسری اور چوتھی روایت کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ احزاب بقرہ کے برابر تھی اور اس میں رجم کا قانون بھی تھا، اس 'آیت رجم' کے الفاظ اتنے بے تکے ہیں کہ انھیں کلام الٰہی کہنا بدترین قسم کی گستاخی ہے، اور تماشہ یہ ہے کہ یہ عبارت قانون رجم کو ثابت کرنے کے بجائے اس کی بنیاد ہی منہدم کر رہی ہے، اس لیے کہ رجم کی بنیاد احصان تام پر ہے نہ کہ شیخوخت پر۔

پانچویں روایت کا حاصل یہ ہے کہ مصحف عائشہؓ میں آیت صلوٰۃ وسلام (جو الاحزاب میں واقع ہے) کے بعد وعلی الذین یصلون الصفوف الاول کے الفاظ بھی درج تھے، تو یہ الفاظ اپنے ذاتی مصحف میں حضرت عائشہؓ نے دراصل بطور تشریح کے اس وقت لکھے تھے جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے من جانب اللہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلی صفوں میں نماز پڑھنے والوں پر رحمت بھیجتے ہیں۔ (اگرچہ یہ رحمت اس رحمت سے مختلف ہے جو اللہ کے یہاں نبیؐ کے لیے خاص ہے) تاہم حضرت عائشہؓ نے اشتراک فی الحکم کی بنا پر بطور یادداشت کے یہ الفاظ اپنے مصحف میں لکھ لیے تھے لیکن چونکہ یہ الفاظ قرآن نہ تھے اس لیے حضرت عثمانؓ نے جب اس طرح کے مصاحف نذر آتش کرائے اور مصحف صدیقی کی نقول تیار کرائیں تو مصحف عائشہ بھی اسی بنیاد پر جلا دیا گیا کہ اس میں قرآن کے ساتھ غیر قرآن بھی شامل تھا، اور عائشہؓ اگرچہ غیر قرآن کو قرآن باور کر لینے کے فتنے سے مامون تھیں، لیکن ان مصاحف سے جو لوگ اپنے لیے نقل کرتے تھے ان کا فتنے میں مبتلا ہو جانا متوقع تھا اور عملاً ایسا ہو بھی چکا تھا، اس لیے مصحف صدیقی کے سوا تمام مصاحف جلا دیے گئے۔

اس قسم کی اور بہت سی روایتیں ہیں مثلاً:

عن ابی واقد اللیثی.....	ابو واقد لیثی سے روایت ہے.....
فجئتُ ذات یوم فقال ان اللہ	میں ایک دن آپؐ کے پاس آیا تو آپ
یقول انا انزلنا المال لاقام	نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم
الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ ولو ان	نے مال اتارا ہے نماز قائم کرنے اور
لابن آدم وادیا من مال	زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے اگر ابن آدم کے مال

لاحب ان یکون الیه الثانی و
لو کان الیه الثانی لاحب ان
یکون الیه الثالث ولا یملأ
جوف ابن آدم الا التراب
ویتوب الله علی من تاب۔

سے بھری ایک وادی مل جائے تو دوسری
کی خواہش کرے گا اور دوسری مل جائے
تو تیسرے کی خواہش کرے گا۔ ابن آدم
کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ اللہ ہر اس
شخص کی توبہ قبول کرے گا جو تائب ہوگا۔

یا اسی انداز کی ایک اور روایت

عن ابی بن کعب قال قال لی
رسول الله صلی الله علیه وسلم
ان الله امرنی ان اقرأ علیك
القرآن فقرأ لم یکن الذین
کفروا من اهل الکتاب و
المشرکین ومن بقیتها لو ان
ابن آدم سال وادیا من مال فأعطیه
سال ثانیا وان أعطیه ثانیا سال
ثالثا ولا یملأ جوف ابن آدم الا
التراب ویتوب الله علی من تاب
وان ذات الدین عند الله الحنیفیة
غیر الیهودیة ولا النصرانیه و
من یعمل خیرا فلن یکفره۔

ابی ابن کعب سے روایت ہے کہ ان سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں قرآن
سناؤں پس آپ نے سورۃ لم یکن
الذین کفروا سنائی۔ اور اس کے اخیر
میں یہ ہے کہ اگر ابن آدم ایک وادی مال
طلب کرے اور اسے میں دے دوں تو
وہ دوسری طلب کرے گا اور اگر دے دوں تو
تیسری مانگے گا۔ ابن آدم کا پیٹ تو مٹی ہی بھر
سکتی ہے اور جو توبہ کرے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا
اور بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین تو حنیفیت
(کامل یکسوئی) ہے یہودیت یا نصرانیت نہیں
اور جو شخص بھلائی کرے گا تو یہ عمل رائیگاں
نہیں ہوگا۔

یہ روایت جیسا کہ اس کا انداز اور ساخت بتا رہی ہے دراصل رسول اللہ کی کسی تقریر کا جزو ہے اور آپ نے اس میں دین کی بنیادی حکمتیں قرآن کے حوالے سے بیان فرمائیں، لیکن بعد کو لفظ قرآن سے لوگوں کو ایسا دھوکا لگا کہ اسے قرآن سمجھ لیا گیا اور جب اُسے قرآن میں نہ پایا تو منسوخ التلاوۃ مع الحکم کا نظریہ تصنیف کر لیا گیا۔ مزید سنئے:

عن ابی موسی الاشعری قال
نزلت سورة ثم رفعت وحفظ

ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے وہ کہتے
ہیں کہ ایک سورہ اتری پھر وہ اٹھائی

منها ۔ ان الله سَيُؤَيِّدُ هٰذا الدين باقوام لا خلاق لهم ولو ان لابن آدم واديا من مال

گئی اس میں سے یہ حصہ انھیں یاد رہ گیا کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایسے لوگوں سے کرائے گا جو بظاہر نصیبے والے نہیں ہیں (اس کے آگے بھی ابن آدم کی ہوس ناکی والی بات ہے)

مزید ملاحظہ کیجئے :۔

و اخرج ابن ابی حاتم عن ابی موسی الاشعری قال کنا نقرأ سورة نشبهها باحدی المسجات ما نسیناها غیر انی حفظتُ منها یایها الذین امنوا لا تقولون مالا تفعلون فتکتب شهادة فی اعناقکم فتسئلون عنها یوم القیٰمة۔

ابو موسیٰ اشعری ہی سے روایت ہے کہ ہم لوگ مسجات کی مانند ایک سورہ پڑھا کرتے تھے پھر وہ سورہ بھول گئی البتہ ایک حصہ اس کا یہ یاد ہے کہ اے لوگو جو ایمان لائے ہو وہ بات مت کہو جو کرتے نہیں ہو ورنہ وہ گواہی تمہاری گردن میں لکھ دی جائے گی اور قیامت کے روز اس کے بارے میں سوال ہوگا۔

عن بن عدی قال قال عمرؓ اَنَا نَقرأُ "لَا ترغبوا عن ابائکم فانّهٗ کفر بکم قال لزید ابن ثابت أکذلك ؟ قال نعم !

عدی بن عدی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم یہ پڑھا کرتے تھے 'لا ترغبوا عن آبائکم فانهٗ کفر بکم' پھر انھوں نے زید بن ثابت سے اس کی تصدیق چاہی تو انھوں نے بھی اس کی تائید کی۔

عن المسور بن مخرمه قال قال عمر لعبد الرحمٰن بن عوف "الم تجد فیما انزل علینا أن جاهدوا کما جاهدتم اول مرة" فانا لا نجدها قال سقطت فیما اسقط من القرآن

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے عبد الرحمٰن ابن عوف سے کہا کہ کیا تم 'جاهدوا کما جاهدتم اول مرة' کے الفاظ قرآن میں نہیں پاتے اس لیے کہ اب ہم اسے نہیں دیکھتے تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کے جو حصے ساقط ہو گئے ہیں

ان میں یہ بھی ہے۔

مسلمة بن مخلد الانصاری قال لهم ذات یوم اخبرونی بآیتین فی القرآن لم یکتبا فی المصحف فلم یخبروه و عندهم ابو الکنود سعد بن مالك فقال ابن مسلمة ان الذین آمنوا وهاجروا وجاهدوا فی سبیل الله باموالهم وانفسهم اولئك ابشر وانتم المفلحون والذین آووهم ونصروهم و جادلوعنهم القوم الذین غضب الله علیهم اولئك لا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین جزاء بما کانوا یعملون ۵

مسلمہ بن مخلد انصاری نے لوگوں سے پوچھا کہ مجھے قرآن کی وہ دو آیتیں سناؤ جو مصحف میں درج نہیں کی گئیں لوگوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ان کے درمیان ابوالکنود سعد بن مالک بھی تھے۔ ابو مسلمہ نے کہا وہ آیتیں یہ ہیں انّ الذین امنوا وهاجروا سے وانتم المفلحون تک اور دوسری آیت والذین آووهم سے کانوا یعملون تک۔

وفی الصحیحین عن انس فی قصة اصحاب بئر معونة الذین قتلوا وقنت یدعو علی قاتلهم" قال انسؓ ونزل فیهم قرآن قرأناه حتی رفع "ان بلغوا عنا قومنا انا لقینا ربنا فرضی عنا وارضانا

اور صحیحین میں حضرت انس سے قصہ بئر معونہ میں شہید ہونے والوں کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے قاتلوں کو قنوت میں بددعا کی گئی۔ حضرت انس نے کہا کہ ان کے بارے میں قرآن نازل ہوا کہ "ہماری قوم کو ہماری طرف سے یہ پیغام دیدو کہ" ہم نے اپنے رب سے ملاقات کی تو وہ ہم سے راضی ہوگیا اور ہمیں راضی کر دیا" ہم اس کو پڑھتے رہے حتیٰ کہ اسے اٹھا لیا گیا۔

وفی المستدرك عن حذیفة قال ما تقرأون ربعها یعنی براءة۔ قال الحسین بن انباری فی کتابه الناسخ والمنسوخ "ومما رفع رسمه من القرآن ولم یرفع من القلوب حفظه سورتا القنوت فی الوتر وتسمی سورتی الخلع والحفد"

مستدرک میں حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ "تم سورۃ براۃ کا صرف چوتھائی حصہ پڑھتے ہو" حسین بن انباری نے اپنی کتاب ناسخ ومنسوخ میں کہا ہے کہ جن سورتوں کا قرآن میں لکھا جانا منسوخ ہوگیا اور وہ دلوں میں محفوظ ہیں ان میں وتر میں پڑھی جانے والی قنوت کی دو سورتیں ہیں۔ ان کا نام خلع اور حفد تھا۔

یہ روایتیں یا اسی قسم کی بعض اور روایتیں ہیں جو عام طور پر اس موضوع سے متعلق کتابوں میں مذکور ہیں، ان تمام روایتوں میں بلا استثنا اخباری نوعیت کی چیزیں ذکر کی گئی ہیں، حالانکہ یہ بات بالکل طے ہے کہ نسخ کا وقوع فقط احکام میں ہی ہوسکتا ہے اخبار میں نہیں۔ نیز ان روایتوں میں جن عربی عبارتوں کو قرآن منسوخ ظاہر کیا گیا ہے اور ان میں جو باتیں اور حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ حقائق قرآن مجید میں تمام کے تمام آج بھی موجود ہیں اور اتنے قطعی ہیں کہ ان کے نسخ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ دراصل اس قسم کی تمام چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابہ کرام کی تقریروں اور مواعظ کا وہ حصہ ہیں جو انھوں نے قرآن کے حوالے سے بیان فرمایا اور لوگوں نے انھیں اپنے انفرادی مصاحف میں بطور یادداشت کے تفسیر قرآن کے طور پر لکھ لیا تھا بعد کے کچھ لوگ اس فرق کو قائم نہ رکھ سکے اور انھوں نے ان تمام زیادات اور تفسیرات کو بھی قرآن سمجھ لیا اور اس طرح اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک عرصہ تک یہ اختلافات کچھ دبے دبے سے رہے لیکن خلافت عثمانی میں یہ اختلافات ایک خطرناک فتنے کی شکل اختیار کر گئے۔ بعض صحابہؓ حذیفہ بن الیمان وغیرہ کی تحریک پر حضرت عثمان نے اس اختلاف کی علت متعین کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اختلاف مصاحف دراصل اس فتنے کی بنیاد ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان نے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے اس کا علاج اس طرح کیا کہ مصحف صدیقی کی متعدد نقلیں کرا کے مقبوضہ علاقوں میں روانہ فرمائیں اور ساتھ ہی ایک معتبر معلم بھی بھیجا اس کارروائی کے بعد فتنے کی اصل بنیاد تعدد مصاحف کو ختم فرمایا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر مصحف صدیقی سے کسی بھی اعتبار سے مختلف مصاحف کو نذر آتش کیا اور اس طرح مکمل طور پر یہ فتنہ ختم ہوگیا، لیکن زبانی طور پر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے بعض چیزیں بعد کے لوگوں تک بھی پہونچ گئیں اور چونکہ مصاحف کے حوالے سے پہونچی تھیں اس لئے لوگوں نے انھیں مغالطے سے

قرآن سمجھ لیا اور جب قرآن میں یہ چیزیں نہ مل سکیں تو مجبوراً نئے نئے نظریات کی بناء لینی پڑی جو روایات ہم نے گذشتہ صفحات میں نقل کی ہیں اُن سے یہ بات پوری طرح الم نشرح ہوجاتی ہے کہ حضرت عثمان نے جن مصاحف کو ختم کرایا تھا وہ مصحف صدیقی سے محض وجوہ قرارات اور اختلاف لغات کی وجہ سے ہی مختلف نہ تھے بلکہ ان میں کمی بیشی تک کا اختلاف تھا اور ان مصاحف میں احادیث قدسی، بعض اہم ادعیہ ماثورہ، اور توضیحی الفاظ وغیرہ بھی کثرت سے موجود تھے اور فتنہ کی بنیاد وجوہ قرارات و اختلاف لغات سے کہیں زیادہ عبارات اور الفاظ کی کمی بیشی تھی، اور اس فتنے کا خاتمہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ اس طرح کے مصاحف کو نابود کر دیا جائے، اور عہد صدیقی پر مرتب کئے ہوئے متفق علیہ مصحف کی اشاعت کی جائے' ــــــ۔ قرآن ایک معجزہ ہے اور یہ اعجاز اس کی کسی آیت یا سورۃ کا ہی خاصہ نہیں ہے بلکہ قرآن کامل طور پر اپنے مکمل اجزاء و سُور سمیت معجزہ ہے۔ اگر آپ کسی عربی عبارت کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ قرآن کی منسوخ التلاوۃ مع الحکم یا دون الحکم آیتیں ہیں تو اصل عبارت کا مندرجہ ذیل اصولوں پر پورا اترنا ضروری ہے اگر ان قطعی اصولوں پر ایسی منسوخ التلاوۃ عبارت پوری نہیں اترتی تو دو باتوں میں ایک بات یقینی طور پر پیش آئی ہے، یا تو وہ عبارت گھڑی گئی ہوگی یا پھر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی مغالطہ پیش آیا ہے۔ ایسی صورت میں ان کے راویوں کی ثقاہت کی اور عدم ثقاہت کی بحث فضول ہوگی۔

۱۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ عبارت" اپنے ادبی معیار میں بالکل قرآن کے مساوی ہو اور کسی بھی طرح اس کا اسلوب اور ادبی معیار قرآن کے اسالیب سے فروتر نہ ہو، اس لیے کہ قرآن کا تو اعجاز ہی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اُس نے مختلف النوع حقائق کی تعبیر کے لیے مختلف اسالیب اختیار کئے لیکن تمام اسالیب کا ادبی معیار حیرت انگیز طور پر ایک ہے اور کہیں بھی اس میں اختلاف نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی کلام میں یہ بات پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اور یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کو خود قرآن مجید نے اپنی حقانیت کے لیے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہے:

افلا یتدبرون القرآن ط و	ترجمہ: کیا لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے
لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا	اگر یہ اللہ کے سوا اور کسی کی طرف سے
فیہ اختلافا کثیرا ہ ؎	ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی
	پائی جاتی۔

اب ظاہر ہے کہ جن عبارتوں کو قرآن کی منسوخ عبارت کہا جا رہا ہے، ان عبارتوں کا ان کمالات سے

آراستہ ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ غیر منسوخ قرآن کا۔[۱۲] اس لیے کہ وہ بھی من جانب اللہ قرآن میں شامل تھیں فقط یہ فرق ہوا کہ ان کو ضرورت کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے منسوخ کر دیا گیا۔

۲۔ دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ جن عبارتوں کو منسوخ کہا جا رہا ہے ان کی بنیاد کیا ہے؟ ضروری ہے کہ شارع کی طرف سے واضح الفاظ میں اس بات کا ثبوت بہم پہونچ جائے کہ فلاں فلاں عبارت منسوخ کر دی گئی ہے، اس لیے کہ یہ براہ راست نبی کی ذمہ داری ہے اور جس طرح اس پر وحی الٰہی کی تبلیغ ضروری ہے اتنا ہی یہ بھی ضروری ہے کہ منسوخ وحی کو غیر منسوخ سے پوری شدت کے ساتھ الگ کرائے۔ اب سوال یہ ہے کہ جن عبارتوں کے متعلق منسوخیت کا دعویٰ کیا گیا ہے کیا وہ عبارتیں ان دونوں شرطوں پر پوری اترتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ عبارتیں نہ ادبی اعتبار سے قرآن کے ہم پایہ ہیں اور نہ ہی ان کی منسوخیت کا کوئی ثبوت ہے۔[۱۳]

اس مسئلہ میں اب تک ہم نے جن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ان سب سے بڑی ایک ایسی غلطی اکثر اہل علم سے صادر ہوئی ہے جو دراصل ان تمام پیش آمدہ مغالطات کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ اکثر اہل علم قرآن کی تمام خوبیوں اور اعجاز کو تسلیم کرنے کے باوجود اسے ایک ایسی کتاب مانتے ہیں جس کا کوئی "نظم" نہیں ہے گویا وہ 'مجموعہ مکاتیب' کی طرح ہے جن میں کسی ترتیب کا ہونا سرے سے ضروری نہیں ہوتا، گویا اس عظیم الشان کتاب میں احکام، قصص، مواعظ اور مابعد الطبیعی مسائل اور دوسری اہم چیزوں کو یوں ہی کسی ربط و مناسبت کے بغیر جمع کر دیا گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جب قرآن میں کسی ترتیب و تنظیم کا تصور ہی نہیں تھا تو اس قسم کے خیالات (جن کا ذکر ابھی منسوخ الحکم مع التلاوۃ اور منسوخ التلاوۃ دون الحکم کے نام سے قریب کے صفحات میں تفصیل سے گذر چکا ہے) کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب انگیز چیز نہیں ہے ـــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید مکمل طور پر اتنا مربوط ہے اور اس کی ہر آیت اور سورت سابق و لاحق سے اس حد تک مرتبط ہے کہ اگر ہم اس ربط کی تعبیر "منطقی اور طبیعی ربط" سے کر دیں تو یہ عین حقیقت کی ہی تعبیر ہوگی۔ قرآن اپنے نظم کے اعتبار سے اتنا حساس واقع ہوا ہے کہ اگر اس میں ذرا سا بھی فرق کر دیا جائے تو پورا سلسلۂ کلام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کے نظم کو سمجھنا اگرچہ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہنا اور لکھنا آسان ہے، لیکن حقیقت میں قرآن مجید کو کما حقہ سمجھ لینا اور اس کی حقیقی مرادات کو پا لینا نظم کی عقدہ کشائی کے بغیر سخت مشکل ہے (اس مشکل کے حل میں نیز فہم قرآن کے لیے بعض نہایت اہم اصول کی جانب رہنمائی رئیس المفسرین علامہ حمید الدین الفراہی قدس اللہ سرہ کی قرآنیات سے متعلق تصانیف سے پوری

حاصل کی جاسکتی ہے)

منسوخ التلاوۃ دون الحکم کے نظریہ پر بحث

بھلا اس بات میں کیا معقولیت ہے کہ حکم تو باقی رہے لیکن حکم کی عبارت منسوخ کر دی جائے، سوال یہ ہے کہ حکم کی بنیاد کس چیز پر ہوتی ہے؟ عبارت پر یا کسی اور چیز پر؟.... عبارت کے علاوہ اگر کوئی چیز ہوتی ہے تو اس کی نشاندہی ضرور ہونی چاہیے، لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ 'حکم' کا قطب مدار 'حکم' کی عبارت کے علاوہ کسی اور شے کو سرے سے قرار دیا ہی نہیں جاسکتا، عقل سلیم اس بات کو بداہتہً غلط قرار دیتی ہے، لیکن یہ بھی اس دنیا کے اعاجیب میں سے ہی ہے کہ یہاں غلط سے غلط بات کے ماننے اور تسلیم کرنے والے کثرت سے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل علم حضرات کا ایک بڑا طبقہ اس برخود غلط بات کو نہ صرف مانتا ہے بلکہ پورے زور و شور سے اس کی حمایت بھی کرتا ہے اور بعض ظالم تو اس حد تک تجاوز کر جاتے ہیں کہ جو آدمی ان کی اس عجیب و غریب بات کو تسلیم نہیں کرتا اس پر گمراہی تک کے فتوے چسپاں کر دیتے ہیں۔ لیکن ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس نظریے کے ثبوت میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کی کیا قدر و قیمت ہے؟

قرآن و سنت سے اس نظریے کے ثبوت میں ہرگز کوئی چیز پیش نہیں کی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت کی کوئی بات کبھی خلاف عقل سلیم نہیں ہوسکتی، اس نظریے کے ثبوت میں بعض عبارتیں مشہور ہیں، اُن میں سے زیادہ مشہور [illegible] عبارت الفاظ کا وہ بے ڈھب اور عجیب و غریب مجموعہ ہے جسے اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ رجم کا قانون ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے اور یہ عبارت قرآن مجید کی سورۂ نور یا سورۂ احزاب (علی اختلاف الروایات) میں نازل کی گئی تھی اور رجم کا دار و مدار دراصل اسی عبارت پر ہے، عبارت یہ ہے "الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھا نکالاً من اللہ" بعض روایتوں میں البتہ کا لفظ بھی ملتا ہے، اس عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے "بوڑھا اور بوڑھی اگر زنا کریں تو انھیں سنگسار کر دو" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ زنا کا صدور اگر جوان مرد و عورت سے ہوگا تو وہ "رجم" نہیں کئے جائیں گے بلکہ انھیں وہ سزا دی جائے گی جو سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ میں بیان ہوئی ہے، یعنی مناطِ رجم دراصل زنا ہی نہیں ہے لیکن بڑھاپے میں پہونچ کر زنا کا ارتکاب ہے، یہ ہی جرم اگر جوانی میں صادر ہو جائے تو اس کی سزا فقط مأۃ جلدۃ ہے۔ قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ امت نے کبھی ایک لمحے کے لیے کسی بھی دور میں کیا اس حکم کی تعمیل کی ہے؟

برخلاف اس کے اجماع امت قرآنی اجمال اور سنّت کی تفسیر و توضیح اور عملی مثالوں سے متواتر طریقے پر اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ مناط رجم دراصل زنا مع الاحصان ہے نہ کہ زنا کا بڑھاپے میں ارتکاب ۔۔۔ رجم کو ثابت کرنے کے لیے عبارت بھی خوب گڑھی گئی جس سے رجم کی بنیاد ہی منہدم ہوگئی۔ تماشہ یہ ہے کہ اس برخود غلط عبارت کو جسارت کے ساتھ قرآن کی منسوخ التلاوۃ باقی الحکم آیت بتایا جاتا ہے اور مدرسوں میں بڑے زور شور سے اس پر بحث کی جاتی ہے۔ کیا کوئی اہلِ علم بتائے گا کہ اس "آیت" کو سورۂ نور یا سورۂ احزاب کے کون سے رکوع سے نکالا گیا ہے؟ اور یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ یہ عبارت قرآن کی منسوخ التلاوۃ "آیت" ہے، ظاہر ہے کہ کسی آیت کو نازل کرنا یا نازل شدہ کو منسوخ کرنا براہ راست اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے جس میں نبی کی کسی خواہش کا بھی ادنی دخل نہیں ہوسکتا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ اعلان کہاں ہے جس کے ذریعہ اُس نے اپنے قطعی حکم "قانون رجم" کے مذکورہ الفاظ کو واپس لیا ہو اور کیا عجمیوں کی گڑھی ہوئی اس بے معنی عبارت میں قرآن کے عدیم النظیر ادبی اسلوب اور اعجاز کی کچھ بھی خوشبو محسوس ہوتی ہے؟ کیا معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کو اپنی بات اور قانون رجم بندوں تک پہونچانے کے لیے صحیح الفاظ بھی دستیاب نہ ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ کچھ ملحدوں نے عیاشوں اور زانیوں پر رحم کھا کر یہ عبارت گڑھ دی اور اس طرح اس کا صور پھونکا کہ ہمارے مخلص ارباب تحقیق بھی اس کا شکار ہوگئے۔ روایت پرستی کے فتنے کی ہی یہ کرامت ہے ورنہ جو لوگ اس بے تکی عبارت کو قرآن مانتے ہیں اور زور شور سے اس کی حمایت فرماتے ہیں رجم کے لیے فتویٰ وہ بھی زانی محصن ہونے کی شرط پر ہی دیتے ہیں۔ اگر کوئی بوڑھا یا بوڑھی اس فعل کا ارتکاب کرے اور وہ محصن نہیں ہے تو اس کے لیے سزائے تازیانہ ہی بتاتے ہیں لیکن اس "آیت" کو بھی باقی مانتے ہیں۔ اس خطرناک غلطی کا ارتکاب وہ "محققین" بھی کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں جو بڑے فخر و ناز کے ساتھ 'خطا فی الکفر' سے محفوظ رکھنے والے علم (منطق) کو رات دن تعلیم گاہوں میں قرآن و سنّت سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے ہیں اور اس میدان میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے ۔۔۔۔۔۔۔

غالباً یہ غلط فہمی صحیحین میں وارد ایک صحیح روایت سے لاحق ہوئی ہے، روایت میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن کا قطعی غلط مطلب لے لیا گیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

عن عمر بن الخطاب	عمر بن الخطاب سے روایت ہے کہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنہ خطب،	انھوں نے ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد
فقال ان اللہ بعث محمداً	فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بالحق وانزل علیه الکتاب، فکان فیما انزل الله علیه آیة الرجم، قرأناها، ووعیناها، وعقلناها، فرجم رسول الله صلی الله علیه وسلم، ورجمنا بعده، فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل، ما نجد الرجم فی کتاب الله، فیضلوا بترک فریضة انزلها الله، وان الرجم حق فی کتاب الله علی من زنی، اذا احصن، من الرجال والنساء اذا قامت البینة او کان الحبل، او الاعتراف۔ متفق علیه

کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا اور آپ پر الکتاب نازل فرمائی پس اس کتاب میں نازل شدہ احکام و قوانین میں قانون رجم بھی ہے، (یعنی رجم کا حکم) ہم نے اسے پڑھا اور سمجھا اور محفوظ رکھا ہے چنانچہ (اسی بنیاد پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کے حکم پر عمل فرمایا اور آپ کے بعد ہم بھی اس پر عامل رہے ہیں، مجھے خطرہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد کوئی (منکر رجم) یہ کہنے لگے کہ اللہ کی کتاب میں ہمیں رجم کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اور اس طرح رجم کا انکار کرنے والے ایک من جانب اللہ نازل شدہ فریضے کو ترک کر کے گمراہ ہو جائیں (اور یاد رکھو کہ) رجم کا ضابطہ اللہ کی کتاب میں حق اور ثابت ہے ایسے زانی اور زانیہ کے لیے جو احصان کی صفت سے موصوف ہو اور جب اس فعل پر یا تو حجت شرعی قائم ہو جائے یا حمل[1] ہو، یا مجرم اعتراف کرلے۔"

دراصل غلط فہمی جن الفاظ سے ہوئی وہ فکان فیما انزل الله علیه آیة الرجم کا ٹکڑا ہے، چنانچہ ہمارے علمی حلقوں میں عام طور پر اس جملہ کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ "آپ پر اللہ نے جو چیز (یعنی قرآن) نازل فرمائی اس میں آیت رجم بھی تھی"۔ یعنی کان کا ترجمہ تھی، فعل ماضی سے کرتے ہیں اور آیت سے مراد معروف قرآنی فقرہ سمجھ لیا گیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کان جس طرح ماضی کے لیے آتا ہے ٹھیک اسی طرح کان کا استعمال حال کے لیے بھی ہوتا ہے اور آیت سے مراد جس طرح قرآن مجید کے فصیل زدہ فقرے لئے جاتے ہیں بعینہ اسی طرح حکم الٰہی شرعی بھی مراد لیا

جاسکتا ہے عام اس سے کہ وہ قرآن میں ہے یا حدیث وسُنت میں، واضح رہے کہ قرآن مجید کے بین الدفتین میں آج بھی رجم کا قطعی حکم موجود ہے اور سُنت نبوی سے اُس کی جُزئیات ہم تک قابل اعتماد ذرائع سے پہونچی ہیں اور یہ ہی مطلب دراصل فیما انزل اللہ کا ہے، لیکن بدقسمتی سے قلت تدبر کی بنا پر لوگ عام طور پر اس میں مغالطہ کا شکار ہوگئے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس روایت میں کسی قسم کا ادنیٰ اشارہ بھی اس نظریہ کے ثبوت کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی اس میں الشیخ والشیخۃ الخ وغیرہ عبارات کا ہی کوئی ذکر ہے، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ مذکورہ نظریے اور عبارت کے لیے کسی قسم کی علمی بنیاد نہ ہوتے ہوئے بھی نہ صرف یہ کہ عام علمی حلقوں میں اسے تسلیم کر لیا گیا ہے، بلکہ ایک ایسے مسلمہ کی شکل دیدی گئی ہے جس کا ماننا نہ صرف واجب اور مخالفت حرام بلکہ قریب بہ کفر ہے،

اگرچہ مذکورہ روایت سند کے لحاظ سے بھی انتہائی ضعیف درجہ میں ہے، لیکن یہ اصول اپنی جگہ مسلم ہے کہ روایت کے متن اور عبارت میں کوئی علت قادحہ ایسی موجود ہو کہ تاویل کے صحیح اصول کے تحت کسی طرح بات صحیح نہ بیٹھ سکے تو اس روایت کو کسی رعایت کے بغیر رد کر دیا جائے گا، اور اس عبارت (الشیخ والشیخۃ الخ) میں تو اتنی قادح علتیں موجود ہیں جو روایت درایت عقل ونقل کے تمام اصولوں کے بھی خلاف جارہی ہیں نیز بعض دلائل روایات کے ذخیرے میں اس قسم کے موجود ہیں جن سے اس عبارت کی عدم قرآنیت الم نشرح ہوجاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جمع قرآن کے موقع پر حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کا کوئی حصہ دو گواہوں کی گواہی کے بغیر قبول نہیں کیا، چنانچہ حضرت عمرؓ زید بن ثابت کے پاس آیت رجم لے کر آئے تو انھوں نے محض اس بنیاد پر اسے رد کر دیا کہ وہ تنہا تھے جبکہ ضرورت دو گواہوں کی تھی۔ اب اگر یہ قرآن کی ہی کوئی آیت تھی تو آخر اُسے کوئی اور لے کر کیوں نہیں آیا جبکہ قرآن کا ایک ایک حرف متواتر ہے اور بہرحال اگر یہ آیت قرآنی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت قرآن میں چوں کہ موجود نہیں ہے لہٰذا قرآن میں تحریف کے وقوع کا ثبوت ہوگیا، جبکہ یہ بداہتہ اس لیے باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ حفاظت سے متصادم ہے، اور اگر یہ ایسی آیت تھی جس کی تلاوت منسوخ ہوگئی تھی تو اس کے ثبوت سے قطع نظر کرتے ہوئے قابل غور امر یہ ہے کیا حضرت عمرؓ کو اتنا بھی علم نہ تھا کہ یہ آیت منسوخ التلاوۃ ہوچکی ہے، نیز بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول نے اصرار کے باوجود اس آیت کو قرآن میں لکھنے کی اجازت نہیں دی جس کا واضح مطلب اس کی عدم قرآنیت ہے۔ اب ان تمام دلائل وشواہد کے باوجود ان لوگوں کی قصور فہم کی داد دیجئے جو اس گڑھی ہوئی عبارت کو قرآن کی منسوخ عبارت بتاتے ہیں۔

بحث کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'حدیث رضعات' پر بھی کچھ گفتگو کی جائے، اس لیے کہ علمی حلقوں میں اسے بھی قرآن کی منسوخ التلاوۃ، عبارت کہا اور سمجھا جاتا ہے روایت اس طرح ہے:

عن عائشة رضی الله تعالی عنها، قالت فیما کان انزل من القرآن عشر رضعات معلومات ای متحققات ثابتات، وهذا یفید ان الرضاعت اذا کانت تحمل الشکوك لا تفید التحریم) یحرمن ثم نسخن بخمس رضعات معلومات، فتوفی رسول الله صلی الله علیه وسلم وهی فیما یقرأ من القرآن (مسلم)

(یعنی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ قرآن مجید میں 'عشر رضعات' نازل ہوئے تھے (جن کے تحقق کے بعد حرمت رضاعت کا ثبوت ہوجاتا تھا) پھر ان دس رضعات کو پانچ سے بدل دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی لیکن وہ برابر قرآن میں موجود تھے۔

واضح رہے کہ رضعۃ کی حقیقت اس طرح بیان ہوئی ہے:

و اما حقیقة الرضعة فمتی إلتقم الصبیُ الثدیَ وامتص منهٗ ثم ترك ذالك باختیاره من غیر عارض کان ذالك رضعة، وَالقطع لعارضٍ کنفسٍ او استراحت بسیرة اولشیٔ یلهیه ثم یعودُ من قریب لا یخرجها عن کونها رضعة واحدة، وهذا مذهب الشافعیؒ فی تحقیق الرضعة الواحدة وهو الموافق للغة

ترجمہ: رضاعت کی حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ پستان کو منہ لگائے اور اس سے چوسے پھر اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ کے اسے چھوڑ دے تو یہ رضاعت ہے کسی عارضی سبب سے رضاعت منقطع کرنا مثلاً سانس لینا، تھوڑی دیر آرام کرنا اور کسی کام میں لگ جانا پھر جلد ہی لوٹ آنا تو بھی رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ رضاعت واحدہ کے ثبوت میں یہ امام شافعی کا مسلک ہے اور یہی لغت کے مطابق بھی ہے۔

اس روایت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ قرآنی الفاظ کہاں ہیں جو عشر رضعات اور خمس رضعات پر مشتمل تھے؟ ظاہر ہے کہ اس روایت میں تو جناب عائشہ صدیقہؓ نے ناسخ و منسوخ کے اس واقعہ کی اپنے الفاظ میں حکایت کی ہے، لیکن اس عبارت کا علم کہاں سے حاصل ہوگا؟ دوسری بات یہ بھی قابل غور

ہے کہ اس روایت میں ایک ایسی علت قادحہ موجود ہے جس کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو وعدہ الٰہی کی تکذیب لازم ہو جائے گی اس لیے کہ اللہ کا یہ حتمی وعدہ ہے کہ قرآن کامل طور پر محفوظ رہے گا، درانحالیکہ اس روایت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ قرآن مجید میں (کم از کم اس عبارت کی حد تک) تحریف واقع ہوئی ہے، اس لیے کہ نبی کریمؐ کو یہ حکم من جانب اللہ خود قرآن میں دیا گیا ہے کہ

بلغ ما أنزل اليك من ربك — جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر اتارا ہے
(المائدہ۔ ۶۷) — اسے پہنچا دیجیے۔

اور جس طرح نبی کی ذمہ داری ہے کہ وہ نازل شدہ قرآن کو لوگوں تک پہونچائے، یقیناً اتنی ہی ذمہ داری منسوخ چیزوں کو واضح کرنے اور منسوخ عبارات کا اعلان کرنے کی بھی ہے، ورنہ 'غلط در قرآن' کی ذمہ داری میں سب سے زیادہ حصہ براہِ راست نبیؐ کا ہی ہوگا، اور ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان نہیں فرمایا، اعلان اگر فرماتے تو لوگ قرآن میں غیر قرآن کی تلاوت نہ کرتے، روایت کی اس علت کی طرف بعض محدثین نے توجہ ضرور کی ہے، مثلاً امام نوویؒ شارح مسلم شریف نے حدیث کی مذکورہ بالا کمزوری کا دفاع ان الفاظ میں کیا ہے:

معناه ان النسخ بخمس رضعات — ترجمہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ رضعات
تاخر انزاله جدا حتى انه — کی منسوخی کا نزول بہت تاخیر سے ہوا یہاں
توفي وبعض الناس يقرأ خمس — تک کہ آپ کی وفات ہو گئی اور بعض لوگ
رضعات ويجعلها قرآنا متلوا، — خمس رضعات کی ہی تلاوت کرتے تھے اور
لكونه لم يبلغه النسخ لقرب — اس کو متلو قرآن کہتے تھے کیوں کہ قرب کا
عهده، فلما بلغهم النسخ بعد — زمانہ ہونے کی وجہ سے ان تک منسوخی کا
ذلك رجعوا عن ذلك واجمعوا — حکم نہیں پہنچا تھا اس کے بعد جب ان کو اس کی
على ان هذا لا يتلى — منسوخی کا حکم ہوا تو انھوں نے اس سے رجوع
کر لیا اور اس پر اجماع ہو گیا کہ یہ غیر متلو ہے۔

اور پھر اپنی روایتی غلط فہمیوں کو (یعنی منسوخ آیتوں کی سرگانہ تقسیم) کو بطور ایک علمی مسلمہ کے استدلال میں پیش کر دیا ہے، فرض کر لیجیے دس رضعات کو پانچ رضعات سے منسوخ کر دیا گیا لیکن وہ 'خمس رضعات' کے الفاظ کس جگہ موجود ہیں؟ کیا وہ پانچ بھی منسوخ ہو گئے تھے؟ اگر منسوخ ہوئے تو دلیل کیا ہے؟ اور اگر منسوخ نہیں ہوئے تو قرآن کو محرف ماننا پڑے گا، نعوذ باللہ۔ ان اسباب کی بنا پر یہ بات

واضح ہوگئی ہے کہ اس روایت کے راویوں کو غلط فہمیوں سے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا لیکن اصل بات یہ ہے کہ عشر رضعات اور خمس رضعات کی قرآنیت کا دعویٰ ہی باطل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آپؐ پر قرآن نازل ہوا ہے اسی طرح بذریعہ وحی آپ کو بہت سے احکام دیئے گئے تھے جن کا آپؐ کے اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں تھا، ایسے ہی احکام میں سے عشر رضعات اور خمس رضعات بھی تھے (بلکہ اسی معنی میں متعدد صحیح حدیثیں بھی موجود ہیں) راوی نے غلط فہمی سے اس بات کو فیما انزل من القرآن سے تعبیر کر دیا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ قرآن نے حرمت رضاعت کے سلسلے میں ایک جامع اصل ان الفاظ میں قائم کی ہے:

'وامھاتکم اللّٰتی ارضعنکم'	تمہاری وہ مائیں (تم پر حرام ہیں) جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہو۔

لیکن کوئی عورت کتنی مرتبہ دودھ پلانے سے رضاعی ماں بن سکتی ہے؟ یہ خود ایک سوال تھا، دراصل اسی اجمال کو خمس رضعات اور متعدد حدیثوں سے کھول دیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ یوں ہی اتفاقیہ طور پر کسی عورت کا ایک آدھ گھونٹ دودھ پی جائے تو اس سے وہ عورت اس بچہ کی رضاعی ماں نہیں بن جائے گی اور اس عورت پر رضاعت کے احکام جاری نہیں کئے جائیں گے، اکثر فقہی مکاتب فکر آج بھی اسی پر قائم ہیں اور یہی مسلک اقرب الی الصواب ہے، واللہ اعلم۔

ہماری تحقیق کے مطابق قرآن مجید میں تین آیتیں نسخ کے حقیقی معنی کے لحاظ سے منسوخ ہیں اور انھیں کسی بھی صحیح تاویل کی رو سے غیر منسوخ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک آیت سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں ہے:

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا ن الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف ط	ترجمہ: تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقہ سے وصیت کرے۔

اس آیت کو آیت میراث نے منسوخ کیا ہے، مختصر تفصیل یہ ہے کہ 'بقرہ' کی اس آیت میں مسلمانوں پر (عارضی طور پر) یہ فرض کیا گیا تھا کہ اگر کسی شخص کو موت کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو جائیں تو وہ (اگر مال چھوڑ رہا ہے) اپنے مال متروکہ کی وصیت اپنے والدین اور خصوصی اقارب کے لیے اُن کے حصوں کی تعیین کے ساتھ کر جائے، تاکہ بعد میں وراثت کی تقسیم میں کسی نزاع کی نوبت نہ آئے،

آیت وصیت ہجرت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت بعض وجوہ سے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ جامع اور مفصل قانون (جو سورۂ نساء میں نازل ہوا ہے) دفعتہً ان پر نافذ کر دیا جائے کیونکہ معاشرہ ابھی اس کا تحمل نہ کر سکتا تھا، نیز آیت وصیت سے دو فائدے متوقع تھے، ایک اس میں وقتی مشکل کا مناسب حل موجود تھا، دوسرے ان پر یہ بات بھی ظاہر کرنی مقصود تھی کہ متروکہ مال کی تقسیم وارث اور مرنے والے کی خواہش کے مطابق نہیں، بلکہ میت سے درجاتی قرب کے اعتبار سے ہونی چاہیئے، جو جتنا زیادہ میت سے قریب ہوگا اتنا ہی میراث کا زیادہ حقدار ہوگا۔

اصول یہ ہے کہ کسی حکم کو منسوخ اس وقت کہا جائے گا جب منسوخ اور ناسخ میں جمع ناممکن ہو جائے، جمع ہو جانے کی صورت میں کسی حکم کی منسوخیت کا سوال خارج از بحث ہے۔ آیت وصیت اس لیے منسوخ ہے کہ سورۂ نساء میں مذکور قانون وراثت کی دفعات صریحًا اس سے متصادم ہو رہی ہیں، آیت وصیت میں جن لوگوں کے متعلق وصیت کا حکم دیا گیا تھا ٹھیک اُن ہی کے حصص سورۂ نساء میں نازل شدہ قانون وراثت میں بیان کئے گئے ہیں اب اگر ان کے لیے وصیت کو بھی جائز رکھا جائے تو سہام کی تعیین قطعًا بے معنی ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ حدیث نبویؐ میں وارثوں کے لیے وصیت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ آیت وصیت کے تعلق سے دو غلط فہمیاں عام طور پر اہل علم میں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آیت وصیت باقی ہے یعنی منسوخ نہیں ہوئی ہے، البتہ سُنت سے اس کی تخصیص ایک ثلث کی مقدار تک کر دی گئی ہے۔ اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں جس وصیت کی ایک ثلث تک میں تحدید کی گئی ہے اس وصیت کا آیت وصیت میں مذکور وصیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ محدودہ وصیت کا من حیثیت الوصیت تو جاہلیت میں بھی رواج تھا، لیکن وہ لوگ اپنی وصیت میں مختلف الانواع کی بے اعتدالیاں کرتے تھے اور ان کی اس غیر معتدل وصیت کی وجہ سے اکثر وہ وارث محروم ہو جاتے تھے جو میراث کے زیادہ حقدار ہوتے تھے، لہٰذا حدیث وسنت میں دراصل اپنی وصیت کو ایک ثلث مال کی مقدار تک مقید کر دیا گیا ہے، جبکہ آیت مذکورہ میں وصیت کا ضابطہ بالکل ہنگامی حالات میں فرض کیا گیا تھا (نہ کہ صرف جائز، جبکہ ایک ثلث والی وصیت محض جائز تھی نہ کہ فرض)

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ آیت وصیت کو حدیث لا وصیۃ لوارث سے منسوخ مانتے ہیں، جبکہ یہ بات بداہتہً غلط ہے، اس بحث سے قطع نظر کہ حدیث قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے یا نہیں، یہ بات بالکل صاف ہے کہ آیت وصیت کا نزول ہجرت کے ابتدائی دور میں ہوا ہے اور میراث کا مفصل قانون ۳ھ کے اواخر یا ۴ھ کے اوائل میں نازل ہوا ہے، بدیہی بات ہے کہ قانون میراث کے نزول

کے بعد یقینی طور پر آیت وصیت پر عمل درآمد موقوف ہوگیا تھا اور میراث کی تقسیم اسی قانون وراثت کے موافق ہونے لگی تھی، درانحالیکہ مذکورہ حدیث سلّمہ میں لسان نبوت سے صادر ہوئی ہے، لہٰذا یقینی طور پر یہ بات طے ہوگئی کہ آیت وصیت کو قانون وراثت نے ہی منسوخ کیا ہے، نہ کہ اس حدیث نے، البتہ اس حدیث کو بیان نسخ اگر کہا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

باقی دو آیتیں جو منسوخ ہیں وہ سورۂ نساء کی علی الترتیب آیت نمبر پندرہ اور سولہ ہیں، آیتوں کی عبارت اس طرح ہے:

وَ الّٰتِی یاتین الفاحشۃ من	ترجمہ: تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری
نسائکم فاستشھدوا علیھن	کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار
اربعۃً منکم، فان شھدوا	آدمیوں کی گواہی لو اور اگر چار آدمی
فامسکوھن فی البیوت حتی	گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند
یتوفاھن الموت او یجعل اللہ	رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا
لھن سبیلا ہ والذان یاتیانھا	اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔
منکم فآذوھما، فان تابا و	اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب
اصلحا فاعرضوا عنھما ان اللہ	کریں ان دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ
کان توابا رحیما ہ	توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انھیں چھوڑ دو
	کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم
	فرمانے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں کو سورۂ نور کی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے:

الزانیۃ و الزانی فاجلدو کل	زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے
واحد منھما مائۃ جلدۃ ولا تاخذ	ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس
کم بھما رأفۃ فی دین اللہ	کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے
ان کنتم تومنون باللہ و	میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور
الیوم الآخر ولیشھد عذابھما	روز آخر پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا
طائفۃ من المومنین۔ (النور-۲)	دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہے

سورۂ نساء کی مذکورہ دونوں آیتیں دراصل وہ سزا بیان کرتی ہیں جو قرآن نے اوّلاً اسلامی معاشرہ

کے کامل استحکام سے قبل اس جُرم عظیم کی روک تھام کے لیے رکھی تھیں۔ پہلی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ:
"تمہاری عورتوں میں سے جن پر (فاحشہ) یعنی زنا کا جرم چار گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے تو ان عورتوں کو تاصدورِ حکم ثانی قید کر دو یا ان کو اسی حالت میں موت آجائے" دوسری آیت کا حاصل یہ ہے کہ اگر زنا کے دونوں ارکان تم ہی میں سے ہوں (یعنی مسلمان ہوں) تو انھیں ایذا پہنچاؤ، اور اگر وہ اپنے جُرم سے باز آجائیں تو اُنھیں چھوڑ دو اور اُن سے اعراض کرو" یہ بات قابلِ غور ہے کہ پہلی آیت فقط زنا کے ایک رُکن (عورت) کی تادیب سے بحث کرتی ہے، جبکہ دوسری آیت دونوں رکنوں سے بحث کرتی ہے، چنانچہ اس ظاہری فرق کی بنیاد پر ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں مفسرین میں اختلاف ہو گیا ہے، اس اختلاف کی تفصیل تو اس موضوع سے خارج ہے، لیکن ان حضرات کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے، جنھوں نے پہلی آیت کو زنا کی اس صورت کے ساتھ خاص کیا ہے جبکہ اس فعل کے دو رکنوں میں سے ایک (عورت) مسلمان ہو اور اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہو۔ اور دوسرا فریق غیر مسلم ہونے کی بنا پر اسلامی معاشرہ کے دباؤ سے آزاد ہو، اور چوں کہ ابھی حالات بھی ایسے نہ تھے کہ اسلامی قانون کی گرفت غیر مسلموں تک دراز کر دی جاتی اس لیے اسلامی معاشرہ کو مزید گندگی سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلمان زانیہ عورتوں کے متعلق حبس فی البیوت کا حکم دیا گیا، اور اس طرح اُن کے آشناؤں سے ملنے کا راستہ بند کر دیا گیا، دوسری آیت زنا کی اس صورتِ حال سے متعلق سزا بیان کر رہی ہے جب زنا کے دونوں رکن اور فریق مسلمان ہوں، چونکہ انھیں اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہونے کی بنا پر توبہ کر لینے اور اپنا رویہ درست کر لینے کے مواقع حاصل تھے اس لیے اُن کے لیے حبس فی البیوت کے بجائے ایذاء (تذلیل، تحقیر، مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ، فہمائش اور مناسب تادیب وغیرہ) کا حکم دیا گیا، لیکن اگر اپنے اس عمل سے توبہ کر لیں اور اپنا رویہ درست کر لیں تو ان سے درگذر کر لیا جائے۔

ان دونوں آیتوں کا حکم سراسر عارضی نوعیت کا تھا، اس لیے سورۂ نور میں زنا کے متعلق شرعی حد نازل ہو جانے سے یہ دونوں حکم اس لیے منسوخ ہو گئے کہ سورۂ نور میں مذکور حکم کے ساتھ ان کا جمع کرنا ناممکن ہو گیا۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید میں فقط یہی تین آیتیں منسوخ ہیں۔

اس پورے مضمون اور مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت:

ما ننسخ من آیت او ننسها — ترجمہ: ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے
نات بخیر منها او مثلها — ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر
لاتے ہیں یا کم از کم ویسے ہی۔

میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی حکم کو واپس لینے کے دو طریقے ذکر کئے ہیں، ایک کا نام نسخ ہے جبکہ دوسرے کو انساء کا نام دیا گیا ہے، نسخ کے حقیقی معنی ہیں مٹانا، ہٹانا ختم کرنا وغیرہ، یہ ختم اور ازالہ ایسے طریقے پر ہوتا ہے کہ حکم کی عبارت برقرار رہتی ہے، لیکن حکم کو کسی دوسری آیت سے ختم کر دیا جاتا ہے، لیکن یاد رہے کہ ناسخ و منسوخ کی بحث اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ دو حکموں میں اس طرح کا تعارض پایا جائے کہ تطبیق و توفیق کی تمام صورتیں ناکام ہو جائیں ——— انساء کے معنی ہیں نظر انداز کرنا، بھلانا، اور یہاں مراد ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنے کسی حکم یا احکام کو عبارت سمیت اٹھا لینا، قرآن مجید میں تین آیتیں تو ضرور منسوخ ہوئی ہیں اور ان کی عبارت برقرار ہے لیکن قرآن مجید میں انساء کے وقوع پر کوئی قطعی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی ہے، اس لیے حق یہ ہے کہ قرآن میں انساء کا وقوع نہیں ہوا ہے، جو چیزیں دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں وہ دلیل نہیں بلکہ مغالطے ہیں، اور ظاہر ہے کہ مغالطات سے حقائق ثابت نہیں کئے جا سکتے، البتہ سابقہ کتابوں میں ضرور نسخ و انساء دونوں کا وقوع ہوا ہے ——

علماء کرام نے بالعموم منسوخات کی سہ گانہ تقسیم فرمائی ہے (۱) منسوخ التلاوۃ مع الحکم (۲) منسوخ التلاوۃ دون الحکم (۳) منسوخ الحکم دون التلاوۃ، ان تینوں قسموں میں سے آخری قسم قرآن مجید میں فی الواقع موجود ہے، باقی دونوں قسموں کا قطعاً کوئی وجود نہیں ہے اور محض مغالطات کی دین ہیں۔ منسوخ التلاوۃ مع الحکم کے سلسلے میں جو چیزیں بطور ثبوت کے پیش کی گئی ہیں انھیں بعض حضرات نے اپنی کم علمی کی بنا پر قرآن سمجھ رکھا تھا، جبکہ وہ چیزیں قرآن نہ تھیں بلکہ بعض صحابہ کرام کے ذاتی نسخوں میں بعض تفسیری الفاظ، بعض اہم دعائیں، اور بعض احادیث قدسی وغیرہ موجود تھیں، صحابہ کرام چونکہ اس سلسلے میں غلطی کا شکار نہ ہو سکتے تھے اس لیے وہ تو قرآنی مخطوطات میں اس قسم کی چیزیں یادداشت کے طور پر نوٹ کر لیتے تھے، لیکن بعض نومسلم حضرات اس معاملہ میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور امت میں فتنہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ بالآخر حضرت عثمانؓ ذوالنورین نے ایسے تمام مصاحف کو (جن کے اندر قرآن کے ساتھ غیر قرآن نیز غلط قرارات شامل تھیں) نذر آتش کر دیا اور یہ فتنہ ختم ہو گیا اور قرآن کے اصل نسخہ کی اشاعت بڑے پیمانہ پر کرائی گئی ——— اس قسم کی چیزیں بعض لوگوں کی زبانی بعد کے لوگوں تک بھی پہونچ گئیں، انھوں نے انھیں قرآن میں موجود نہ پایا تو نئے نئے نظریے تصنیف کر لیے گئے۔ قرآن ایک محفوظ کتاب ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ترتیب سے بھی آراستہ ہے اس لیے اس کے اندر سے نہ کسی چیز کو نکالا جا سکتا ہے اور نہ داخل کیا جا سکتا ہے۔

منسوخ التلاوۃ باقی الحکم کے ثبوت میں الشیخ و الشیخۃ الخ اور حدیث رضاعت کو پیش کیا

کیا جاتا ہے، جبکہ ان عبارتوں کو قرآن ثابت کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی دلیل موجود نہیں ہے، اور قانون رجم کا ماخذ یہ واہیات عبارت نہیں بلکہ آیت محاربۃ (المائدہ۔۳۳) ہے۔

حدیث رضاعت کے بعض الفاظ سے اس کی قرآنیت کا وہم ہوگیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عشر رضعات اور خمس رضعات اگرچہ منزل من اللہ تھے لیکن یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے قرآن کے علاوہ بھی بہت سے احکام دیئے گئے ہیں۔

مآخذ و حواشی

۱ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی قدس اللہ سرہٗ تفہیم القرآن البقرہ حاشیہ ۵۴ طبع مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

۲ السیوطی جلال الدین الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۲۶ طبع مشترکہ مصطفیٰ البابی ۱۳۷۰ھ

۳ ممکن ہے بعض اہل علم بعض آیتوں مثلاً سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء اللہ وغیرہ سے قرآن مجید میں انسار کے وقوع پر استدلال کرنے لگیں، تو اس وہم کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ اس آیت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلانا مقصود ہے کہ یہ قرآن مکمل طریقے پر آپ کے حافظے کی گرفت میں رہے گا اور وہ خطرہ جو آپ کو لاحق ہے۔ کہ آپ بھول جانے کے خدشہ سے ڈرتے ہوئے نزول وحی کے وقت بعجلہ وحی کو رٹتے تھے جیسا کہ سورۂ قیامۃ اور سورۂ طٰہٰ وغیرہ میں مذکور ہے۔ وہ ہرگز کبھی پیش نہ آسکے گا آپ مطمئن رہیں، رہا آیت میں مذکور استثناء کا معاملہ تو اس کا مطلب فقط اس قدر ہے کہ بتقضائے بشریت اگر آپ کو کبھی قرآن کی کسی آیت یا لفظ کے سلسلے میں کوئی بھول لاحق ہو جائے تو بالکل بشری نوعیت کی ہوگی، مطلب یہ ہوا کہ آپ کو نزول وحی کے وقت ہی مکمل وحی دائمی طور پر محفوظ کرادی جائے گی، لیکن جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حافظ قرآن مکمل حافظ ہوتے ہوئے بعض اوقات بعض وجوہ سے ان آیات میں بھی بھول کا شکار ہو جاتا ہے جو اُسے بالفعل بھی یاد ہوتی ہیں، اور یہ کام مشیت الٰہی کے تحت ہی وقوع میں آتا ہے اس طرح کی اگر آپ کو بھی کوئی بھول لگ جائے تو وہ الگ چیز ہے اور اس کا وعدہ سے کوئی تعلق نہیں اس قسم کے بعض واقعات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

خلاصہ یہ نکلا کہ آیت سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء اللہ سے جس نیان کے وقوع کا امکان ظاہر ہوتا ہے اُس کا اس انسار سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر قرآن نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۶ میں

کیا ہے اس لیے کہ نُنسِھا کا فاعل براہ راست اللہ تعالیٰ ہے جس کا مفعول وحی الٰہی ہے اور الاعلیٰ میں مذکور جبر، نسیان کا امکان ظاہر کیا گیا ہے وہ بالکل بشری نوعیت کی ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی بشر کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، تاہم اگر کوئی اہل علم قرآن میں وقوعِ النساء پر اصرار کرتے ہوں تو ان کا یہ دعویٰ بہرحال قطعی دلیل کی بنیاد پر ہی ٹھہر سکتا ہے اور یہ کام مدعی کے ذمہ ہے، جہاں تک امکان کی بات ہے تو امکان سے ہمیں انکار نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر ممکن کا وجود ضروری نہیں ناممکن چیزوں کی تعداد جنہ سے متجاوز نہیں واللہ اعلم

۴	الاتقان	۵	الاتقان
۶	الاتقان ج ۲ ص ۲۵	۷	الاتقان صفحہ مذکورہ
۸	الاتقان ج ۲ ص ۲۵	۹	الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۲۵
۱۰	الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۲۶	۱۱	النساء ۸۲

۱۲ ورنہ پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن میں فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے اختلاف ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات خود قرآن مجید کی تصریح کے خلاف ہوگی۔

۱۳ اگر ان عبارتوں پر غور کیا جائے جن کو منسوخ التلاوۃ مع الحکم کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تمام تر عبارتیں یا تو قرآن کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہیں یا اخباری طرز کی ہیں اور ظاہر ہے کہ اخبار یا بنیادی تعلیمات میں نسخ کی بات بھی خارج از بحث ہے۔

۱۴ واضح رہے کہ اکثر فقہائے کرام کے نزدیک مجرد حمل کی بنا پر کسی عورت کو رجم نہیں کیا جا سکتا۔

۱۵ بلوغ المرام مع تعلیقہ اتحاف الکرام صفی الرحمٰن مبارک پوری ص ۳۳۱ طبع مطبعہ سلفیہ بنارس ۱۹۸۲ء

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم کتاب

ایمان وعمل کا قرآنی تصوّر

الطاف احمد اعظمی

○ ایمان وعمل کے مروجہ تصور کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ ○ قرآن وسنت کے نقطۂ نظر کی مدلّل اور دلنشیں تشریح کرتی ہے ○ ایمان وعمل کے تقاضے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ واضح کرتی ہے۔

افسٹ کی طباعت۔ خوبصورت سرورق۔ صفحات ۲۸۰ قیمت ۲۵ روپے لائبریری ایڈیشن ۴۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

مسئلۂ قیاس میں ابن عبدالبر کا موقف

تحریر استاد عبدالقادر عافیہ
ترجمہ محمد اسلام عمری

ابن عبدالبر نے قیاس کی مشروعیت ثابت کرتے ہوئے اپنی بحث کا عنوان "اجتہاد الرأی علی الاصول عند عدم النصوص فی حین نزول النازلہ" رکھا ہے۔ اس عنوان کے ذریعہ وہ قیاس کے لیے بنیادی خطوط فراہم کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنی تائید میں صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجتہادات نیز امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل جیسے ائمہ و فقہاء کے اجتہادات سے متعلق نصوص و آثار نقل کرتے ہیں۔ ان نصوص و آثار کے نقل کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ قیاس شریعت کے مآخذ میں ایک اہم ماخذ ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ قیاس سے متعلق اصولی بحثیں ابن عبدالبر سے پہلے بھی بہت ہوئی ہیں اور ان کے بعد بھی۔ اس مقالہ میں ہمارے پیش نظر قیاس سے متعلق ابن عبدالبر کے نظریہ کا مطالعہ ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی عقلی استدلال اور آثار سے استدلال کے درمیان پیوند کاری کرتے ہیں۔ تاہم وہ زیادہ تر آثار ہی پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ قیاس کے استعمال کے لیے جو دلائل فراہم کرتے ہیں وہ بھی قرآن و سنت سے اور ائمہ مجتہدین کے اجماع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ یہی دلائل ان کی بنیاد اور حجت ہوتے ہیں، لیکن وہ عقلی طریقہ استدلال کبھی کبھی ہی استعمال کرتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری میں۔ جو ابن عبدالبر کا زمانہ ہے اور صحیح قول کے مطابق ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس عہد میں گزرا ہے۔ اصولیات کے مطالعہ کا آغاز مشرق و مغرب میں

لہ یہ مضمون ماہنامہ "دعوۃ الحق" رباط اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۹۰ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع ہوا ہے اردو ناظرین کے افادہ کے لیے یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

یکساں طور پر پہنچ چکا تھا۔ بلاد اسلامیہ کے مشرقی حصہ میں متعدد بڑے علماء سامنے آئے جنھوں نے اصول کا مطالعہ کیا اور اس فن پر انھوں نے عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔ مثال کے طور پر ابو اسحاق ابراہیم اسفرائینی متوفی ۴۱۸ھ ہیں، جنھوں نے الجامع فی اصول الدین' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی اور اصول فقہ پر ایک رسالہ لکھا۔ ابو علی الحسین البصری متوفی ۴۳۶ھ کی کتاب کا نام 'مسائل الخلاف' ہے۔ ابو اسحاق شیرازی متوفی ۴۷۶ھ نے 'الوصول الی مسائل الاصول' تالیف کی، اسی کو اللمع بھی کہتے ہیں۔ موصوف ابو حامد غزالی کے اساتذہ میں سے ہیں ابو حامد غزالی جن کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہوا وہ 'المستصفیٰ' اور 'شفاء العلیل فی بیان مسائل التعلیل' کے مصنف ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے اصولیین بھی ہیں جیسے ابو الحسن علی بن عقیل متوفی ۵۱۳ھ 'الجدل علی طریقۃ الفقہاء' ان ہی کی تصنیف ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں محمد بن علی قفال شافعی (متوفی ۳۳۵ھ) کا ظہور ہوا۔ ان کو عقلی استدلال کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ ان ائمہ کرام سے پہلے ابن الراوندی (متوفی ۲۹۷ھ) ابو الحسن اشعری علی بن اسماعیل (متوفی ۳۲۴ھ) اور ابو منصور (متوفی ۳۳۳ھ) پیدا ہو چکے تھے۔ ابو منصور نے 'ماخذ الشرائع' اور 'تاویلات اہل السنہ' نامی دو کتابیں بھی لکھی تھیں۔

ان تمام اہل علم نے مشرق و مغرب کے اسلامی شہروں میں اصولی مباحث کا اہتمام کیا اور استعمال قیاس کے وجوب پر دلائل فراہم کیے نیز یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کوئی فقیہ قیاس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، انھوں نے اس خیال سے اتفاق نہ کرنے والوں سے مباحثے بھی کیے اور ان پر تنقیدیں بھی کیں۔

پانچویں صدی ہجری میں اصولیین کی جماعت اس لحاظ سے ممتاز رہی ہے کہ اس نے اصولی مباحث میں بڑی باریک بینی سے کام لیا، اس زمرہ میں ابو اسحاق شیرازی زیادہ مشہور ہوئے، اس موضوع پر ان کی تصنیف کا ذکر آچکا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "القیاس" ہے جو اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ ابو اسحاق مغرب کے اہم اصولی علماء کے معاصر ہیں، مثال کے طور پر ابو الولید الباجی (متوفی ۴۷۴ھ) 'المنہاج فی ترتیب الحجاج' اور 'احکام الفصول فی احکام الاصول' کے مصنف اور ابن حزم قرطبی ظاہری (متوفی ۴۵۶ھ) ہیں۔ ان کا انتقال ان کے دوست اور استاذ ابن عبدالبر سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ ابن حزم مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف تھے۔

(۱) الاحکام فی اصول الاحکام (۲) التقریب بحد المنطق والابطال القیاس (۳) مراتب الاجماع ان دونوں کے بعد ابن العربی المعافری (متوفی ۵۴۳ھ) کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں 'المحصول فی علم الاصول' اور 'الانصاف فی مسائل الخلاف' قابل ذکر ہیں۔

ان تمام اصحاب علم نے اصولی مباحث کے ضمن میں مسئلہ قیاس سے بحث کی ہے۔ ابن حزم کے علاوہ ان تمام علماء نے بطور تاکید یہ بات کہی ہے کہ قیاس شریعت کے دیگر بنیادی مآخذ کی طرح ایک ماخذ ہے اور قیاس کو شریعت کا ماخذ تسلیم نہ کرنے والوں کی تردید کی ہے۔ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" میں اس موضوع پر بعض اصولی بحثیں کی ہیں۔ ان میں قیاس کی بحث بھی شامل ہے جس کو وہ اجتہاد کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے۔

الاجتهاد لايكون	اجتہاد صرف ان ہی بنیادوں پر کیا
الاعن اصول يضاف	جاسکتا ہے جو حلت وحرمت کے لیے
اليها التحليل والتحريم	مرجع کی حیثیت رکھتی ہوں۔ ان بنیادی
وانه لايجتهد الاعالم	سرچشموں سے واقفیت رکھنے والا
بها ومن اشكل عليه شئ	شخص ہی اجتہاد کرنے کا حق دار ہے۔
لزمه الوقوف ولم	اگر کسی کو اس عمل میں کوئی مشکل پیش آجائے
يجز له ان يحيل على	تو اس کے لیے توقف کرنا ضروری ہے
الله قولا فى دينه لانظير	اس لیے کہ یہ جائز نہیں کہ اللہ پر اور اس
له فى اصل ولا هو فى	کے دین کے بارے میں کوئی ایسا قول
معنى اصل اى القياس	منسوب کیا جائے جس کی اصل میں کوئی
لاخلاف فيه بين ائمه	نظیر نہ ہو اور نہ ہی (قیاسی طور پر) وہ معنی
الامصار قديما وحديثا	مترشح ہوتا ہو۔ علماء قدیم وجدید کے درمیان
(جامع بیان العلم وفضلہ جلد دوم ص۵۵)	اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس طرح قیاس کے بارے میں ابن عبدالبر کا یہ موقف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی قیاس لازماً کسی اصل ہی پر مبنی ہوگا نیز یہ کہ اصول یعنی قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھنے والا شخص ہی قیاس کرنے کا اہل ہے۔ ان کا یہ موقف ہے کہ جو شخص ان

شرائط کو پورا نہ کرے اور صحیح طریقہ سے قیاس کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ قیاس سے باز ہی رہے۔ کسی حال میں اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے دین کے معاملہ میں کوئی ایسی بات منسوب کرے جس کی کوئی اصل دین میں نہ ہو اور نہ دین کے بنیادی ماخذ سے کسی طرح اس کی تائید ہوتی ہو۔

ابن عبدالبر نے اپنے اس موقف کے لیے جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں اہم ترین دلیل حضرت انسؓ سے مروی حدیث معاذؓ ہے۔ جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا۔ ابن عبدالبر نے اس حدیث کی تائید میں ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جسے مغیرہ بن شعبہ نے متعدد صحابہ اور اہل حمص میں سے حضرت معاذ کے ساتھیوں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شعبی کی وہ روایت جو شریح سے مروی ہے پیش کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے ان کو یہ خط لکھا تھا "جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو اس کا فیصلہ قرآن کی روشنی میں کرو، اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کا حل تمہیں قرآن میں نہ ملے تو سنت رسول کی روشنی میں اس کا فیصلہ کرو، اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کی نظیر کتاب و سنت میں موجود نہ ہو تو لوگوں (اہل علم) کے اجماع کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر کتاب و سنت اور اجماع سے کوئی رہنمائی تم کو نہ ملے تو معروف طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کرو" ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر تم چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اگر اس سے دامن بچانا چاہتے ہو تو ایسا بھی کر سکتے ہو۔ اس کے بعد ابن عبدالبر ایسے نصوص پیش کرتے چلے جاتے ہیں جن سے قیاس کے استعمال کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی سند سے حضرت سعید بن المسیب کی وہ روایت بھی پیش کی ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے سامنے بعض مسائل ایسے پیش آجاتے ہیں جن کا حل قرآن میں نازل کیا گیا ہوتا ہے اور اس بارے میں آپ کی کوئی سنت بھی موجود نہیں ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا اس کے حل کے لیے اہل علم کو جمع کرو یا آپ نے فرمایا عبادت گزار مومنین کو جمع کرو اور اس کا فیصلہ اجتماعی مشورے کی روشنی میں کرو اور کسی ایک فرد کی رائے پر انحصار مت کرو۔

ابن عبدالبر نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے پھر کہا ہے کہ "حضرت عمر نے

ایک شخص سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا کہ اس کے متعلق تو نے کیا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ نے اس قسم کا فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر میں ہوتا تو یوں فیصلہ کرتا، اس شخص نے کہا، آپ کے لیے کیا چیز مانع ہے، آپ ہی فیصلہ فرما دیجئے اس لیے کہ معاملہ اب آپ کے سامنے ہے، حضرت عمر نے فرمایا اگر میں تم کو کتاب وسنت کی طرف لوٹاتا تو ایسا یقیناً کرتا، لیکن اس وقت تو میں اپنی رائے پیش کر رہا ہوں اور میری نظر میں سب کی رائیں یکساں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت زیدؓ اور حضرت علی کے فیصلہ میں مداخلت نہیں کی۔

ابن عبدالبر نے قیاس کے حق میں متعدد نصوص پیش کرنے کے بعد یہ کہا ہے۔ هن کثیر لا یحصی اس طرح کی نصوص بے شمار ہیں (جامع بیان العلم وفضلہ جلد دوم صـ۵۵-۵۹) انھوں نے مزید یہ لکھا ہے کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کا یہ قول مشرق ومغرب میں اس دوران لکھی گئی اصولی کتابوں سے متعلق ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ صحابۂ کرام کے عمل سے بکثرت یہ ثابت ہے کہ وہ نصوص کی عدم موجودگی میں قیاس سے کام لیتے تھے۔ طوالت کے باعث اس کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے امام مزنی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عہد نبوی سے لے کر ہمارے زمانے تک ہر قسم کے مسائل میں دینی حکم کے تعین کے لیے قیاس کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس ضابطہ پر گویا ان کا اجماع ہو گیا ہے کہ حق کی نظیر حق اور باطل کی نظیر باطل ہوا کرتی ہے۔ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ قیاس کا انکار کرے اس لیے کہ قیاس مختلف امور میں مشابہت یا مماثلت کی تلاش کا نام ہے۔

ابن عبدالبر نے اس طرح کے قیاس کی چند مثالیں بھی دی ہیں۔ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "(ان جانوروں کا شکار تمہارے لیے جائز ہے) جن کو تم نے سدھایا ہو اور خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنیاد پر انھیں شکار کی تعلیم دیتے ہو" اس حکم سے شکاری کتوں کے علاوہ دیگر جانوروں کے شکار کی حلت کے بارے میں بھی جو اجماع ہو گیا ہے، وہ بطور قیاس ہی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان "والذین یرمون المحصنات" (النور:۴) (اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں) اس آیت میں محصنات کے حکم میں عفیف مرد بھی شامل

ہیں اس طرح لونڈیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فاذا احصن (النساء:۲۵) (پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں) میں جمہور کے نزدیک قیاساً غلام بھی داخل ہیں۔ اس مسئلہ میں بعض علماء نے اختلاف بھی کیا ہے جو التفات کے قابل نہیں ہیں یہاں داؤد ظاہری اور ابن حزم کے اختلافی مسلک کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح علماء نے دو بہنوں کو وراثت میں حصہ دار بنائے جانے والے حکم پر قیاس کرتے ہوئے بیٹیوں کی وراثت پر اجماع کر لیا ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اس طرح کی مثالیں بے شمار ہیں جن کا ذکر طوالت کا موجب ہوگا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ابن عبدالبر کی پیش کی ہوئی اکثر دلیلیں صحابہ و تابعین اور نامور فقہاء کے عمل سے ماخوذ ہیں۔ ابن عبدالبر نے داؤد ظاہری کے اس خیال کی تردید بھی کی ہے کہ وہ جمہور علماء کے برخلاف درج ذیل حدیث کی بنا پر سود کو ان ہی مذکورہ چھ چیزوں میں منحصر قرار دیتے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے۔

البر بالبر والشعیر	گیہوں کے بدلے گیہوں، جَو کے بدلے
بالشعیر والتمر بالتمر و	جَو، کھجور کے بدلے کھجور، سونا کے بدلے
الذھب بالذھب والورق	سونا، چاندی کے بدلے چاندی، اور
بالورق والملح بالملح الامثلا	نمک کے بدلے نمک، برابر برابر اور ہاتھوں
بمثل ویدًا بیدٍ۔	ہاتھ ہونا چاہیے۔

داؤد ظاہری دوسری اشیاء کو ان مذکورہ چیزوں پر قیاس نہیں کرتے، ان کے نزدیک چنا، دال اور اس طرح کی دوسری کھائی جانے والی اور جمع کی جانے والی اشیاء کے تبادلے میں ربا کا اطلاق نہیں ہوگا۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ علماء نے ان کے اس خیال کی تردید کی ہے اور انھوں نے حدیث میں مذکور اشیاء کے مفہوم میں آنے والی ہر شی کو اس پر قیاس کیا ہے اور یہ حکم لگایا ہے کہ ان کے تبادلہ میں بھی وہ دونوں شرائط لازمی ہوں گی یعنی برابر برابر ہو اور نقد ہو۔

ابن عبدالبر نے داؤد ظاہری کے دلائل کا ذکر کر کے ان کی تردید کی ہے وہ اس تردید میں ابن حزم کا نام لیے بغیر ان پر تنقید کرتے ہیں اور انھیں داؤد کے بعض موافقین یا متبعین جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ داؤد ظاہری، نظام یا بعض معتزلہ کے معتقد ہیں۔ حدیث معاذ ــــ جس پر ابن عبدالبر کے نظریہ

کی بنیاد ہے ـــــ کے بارے میں داؤد ظاہری نے کلام کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اپنی طرف سے اس کا دفاع کیا ہے اور ان کے خیال کی تردید کی ہے۔ اس بحث کے آخر میں ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ حضرت معاذ کی حدیث صحیح اور مشہور ہے۔ ائمہ عدول نے اس کی روایت کی ہے اور یہ حدیث اجتہاد و قیاس کے سلسلہ میں بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ناپسندیدہ بات صرف یہ ہے کہ اللہ کے دین کے سلسلہ میں بے اصل قیاس اور محض گمان سے کوئی بات کہی جائے۔ جہاں تک اصل کی بنیاد پر قیاس کا معاملہ ہے اور کسی معاملہ کے بارے میں اس کے نظیر کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی بات ہے تو اس میں علماء کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ انھوں نے ان تمام فقہاء و ائمہ کا حوالہ بھی دیا ہے جو اجتہاد و قیاس کے قائل ہیں۔ ان فقہاء میں مدینہ کے سعید بن المسیب، سلیمان بن الیسار، القاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ بن عمر مکہ اور یمن کے عطاء، مجاہد، طاؤس، عکرمہ اور عمرو بن دینار، کوفہ کے علقمہ الاسود عبیدہ، شریح القاضی، مسروق اور شعبی، بصرہ کے الحسن اور ابن سیرین، شام کے مکحول سلیمان بن موسیٰ اور اوزاعی، مصر کے یزید بن ابی حبیب، عمرو بن الحارث، لیث بن سعد اور عبداللہ بن وہب، مالکیہ میں ابن القاسم، اشہب اور ابن عبدالحکم، یہاں تک کہ بغداد کے ابو ثور، اسحاق بن راہویہ اور عبیدہ بن القاسم بن سلام وغیرہ قابل ذکر ہیں، قدیم و جدید دیگر اہل علم بھی اس کے قائل رہے ہیں جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اجتہاد اور قیاس سے کام لیتے تھے۔ "عند ما ینزل بہم" یہ ایسا جملہ ہے جس سے ابن عبدالبر ایک خاص مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ اس بات پر علماء کا اختلاف ہے کہ کسی ضرورت کے بغیر مطلقاً قیاس کرنا درست ہے یا نہیں۔ علماء اور اصحاب فن کا ایک گروہ بغیر کسی ضرورت کے قیاس کے بارے میں عدم جواز کا قائل ہے۔ ابن عبدالبر نے قیاس کے حامی علماء کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان کے برعکس ابراہیم بن سیار النظام اور معتزلہ کی ایک جماعت نے قیاس اور احکام میں اجتہاد کی نفی کا راستہ اختیار کیا۔ اسلاف کے طرز عمل کی مخالفت کی۔ اہل سنت میں سے داؤد بن علی بن خلف اصبہانی نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔

داؤد بن علی کو معتزلہ کا متبع کہتے وقت ابن عبدالبر نے بہت محتاط رویہ اختیار

کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ داؤد اہل سنت والجماعت کے عقیدے اور مسلک کے مخالف نہیں ہیں اور نہ ہی اخبار سے احکام کے استنباط کے معاملہ میں مخالف ہیں۔ انھوں نے فقط اس مسئلہ ـــــ احکام میں قیاس کی نفی ـــــ میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔

قیاس کے بارے میں ابن عبدالبر کی رائے علماء اہل سنت کی رائے کے عین مطابق ہے جو مسلک اعتدال پر قائم اور صحابہ وتابعین کے متبع تھے۔ تمام فقہا کی طرح ابن عبدالبر بھی قیاس کی صحت کے لیے یہ شرط ضروری قرار دیتے ہیں کہ قیاس کسی اصل کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اصل اور فرع میں علت بھی واضح ہونی چاہیے۔ اسی طرح وہ قیاس کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ کسی درپیش مسئلہ کے حل کے لیے قیاس کیا جائے نہ کہ بعد میں آنے والے کسی مسئلہ کی خاطر۔ مالکی علماء کی اکثریت بھی اسی کی قائل ہے۔ ابن رشد نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرع کا حکم جب معلوم ہو جائے تو گویا وہ اصل کی طرح ہے۔ اس فرع سے مستنبط کسی دوسری علت کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ابن رشد کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اصحاب مالک متفق ہیں لیکن فرع کا شمار اصل کی طرح ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ فرع کی علت اور اصل اول یعنی کتاب وسنت اور اجماع کی علت میں اتحاد ہو۔ جب علت مختلف ہوگی تو قیاس بھی باطل ہوگا۔ (المقدمات لابن رشد ۲۱-۲۲)

ابن عبدالبر کی تحریروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں جمہور فقہاء مالکیہ کے موقف کے حامل ہیں اور جو لوگ قیاس کی نفی کے قائل ہیں ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قیاس کے استعمال کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ نیز یہ کہ قیاس کے استعمال سے آدمی نصوص ہی تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ ان نصوص میں موجود احکام کی علت کو معلوم کر کے اس کی بنیاد پر قیاس کر سکتا ہے۔ اس عمل سے مختلف احکام میں اشباہ ونظائر کی موجودگی معلوم ہوتی ہے۔

ابن عبدالبر ان لوگوں پر تعجب کرتے ہیں جو قیاس کے اہم فوائد سے بھی ناواقف ہیں۔ نظام اور ان کے موافقین پر انھوں نے نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ متنوع مسائل کے حل کے لیے قیاس ایک ضروری عمل ہے۔

نقد و استدراک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت

مکرم و محترم جناب سید جلال الدین عمری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تحقیقات اسلامی ستمبر ۱۹۹۱ء کا شمارہ ایک مہربان کی عنایت سے ہم دست ہوا۔ مسلسل مطالعہ کے لیے نہیں ملتا۔

اس میں شہاب الدین انصاری صاحب کا مضمون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت پڑھا۔ فنی تحقیق پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔ البتہ ایک یادداشت پیش کرتا ہوں۔

کتاب الرد علی المنطقین لابن تیمیہ کو عبدالصمد سورتی ناشر کتب عربی۔ بھنڈی بازار بمبئی نے شائع کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۵۴۸ پر لکھا ہے "میں نے احمد آباد کے ماہر فلکیات ہری ہر پراں شنکر بھٹ Prof. H.P. Bhatt سے دریافت کیا کہ سن دس ہجری میں کسوف شمس کس تاریخ کو واقع ہوا تھا۔ اس نے حساب لگا کر بتایا کہ مدینہ میں بروز منگل ۲۹ شوال ۱۰ ہجری مطابق ۲۸ جنوری ۶۳۲ء سورج گرہن واقع ہوا تھا۔

احادیث میں ملتا ہے کہ یہی دن تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا تھا۔ اس طرح سن ہجری اور سن عیسوی کا تطابق ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جنگ بدر کے دن رومیوں کو ایرانیوں پر پہلی فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس کا تعین بھی رومی تاریخوں سے ہوسکتا ہے۔

اس طرح جب دو تاریخوں کا صحیح تطابق عیسوی تاریخوں سے ہو جاتا ہے۔ تو پھر بقیہ سنین نبوت کا تطابق آسان ہے۔

محققین کرام کو چاہیے کہ اس فلکی اور تاریخی نقاط اتصال پر توجہ دیں۔

والسلام

احقر

محمد سلیم

تعارف وتبصرہ

احسن البیان فی علوم القرآن

از - ڈاکٹر حسن الدین احمد

ناشر: حامی بکڈپو، ۱۲۵ مچھلی کمان، حیدرآباد ۲ ۔ اشاعت اکتوبر ۱۹۸۹ء قیمت ۳۰ روپئے

اس کتاب میں تمہیدی کلمات کے بعد قرآن مجید سے متعلق مختلف مباحث اور علوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مباحث پر الگ الگ تصانیف میں اس سے زیادہ شرح وبسط کے ساتھ گفتگو ہوسکتی ہے لیکن کسی ایک ہی کتاب میں ان تمام معلومات کو اختصار وطوالت سے بچتے ہوئے جمع کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ ان مضامین ومباحث میں قرآن مجید، وحی، اجزاء قرآن وغیرہ پر ابتدائی مباحث کے علاوہ علم کتابت، علم تجوید وقرأت، تدوین قرآن، علم ترتیب نزول، علم شان نزول، علم معانی، علم اعجاز، علم تفہیم، فہم قرآن، احادیث وروایات کا مقام، حروف مقطعات، محکمات ومتشابہات، ناسخ ومنسوخ، کتب مقدسہ اور تحریف جیسے عناوین کے تحت معلومات کو یکجا کیا گیا ہے اور علم تفہیم اور حروف مقطعات وغیرہ بعض مباحث میں اپنے خیالات یا نتائج تحقیق بھی پیش کیے گئے ہیں۔

اس قدر اہم موضوع پر لکھنے کے لیے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے، اس لیے کہ قرآن مجید کی اصل زبان عربی ہے اس پر لکھا جانے والا علمی و تفسیری سرمایہ بڑی مقدار میں اسی زبان میں ہے۔ مصنف نے بعض عربی کتابوں کے نام ضرور گنائے ہیں اور کتاب میں بعض مقامات پر ان کے حوالے بھی دئے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے حوالے ثانوی مآخذ سے لیے گئے ہیں ان کے اصل مآخذ اردو اور انگریزی زبان کی کتابیں ہیں۔ کتاب کی پشت پر درج عبارت میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔ اس ایک کمی کی وجہ سے کتاب میں بعض بہت ہی نمایاں خامیاں راہ پاگئی ہیں۔ مثال کے طور پر عربی الفاظ اور عبارتوں اور قرآن مجید کی آیات وغیرہ کا صحیح طور پر درج نہ ہونا۔ بطور مثال صفحات ۱۰، ۱۲، ۳۵، ۵۲، ۵۳، ۶۲، ۶۳، ۷۱، ۷۲، ۷۴، ۸۲، ۸۷، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۸۶

۲۰۸، ۲۱۸، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۵۲، ۲۵۴ ملاحظہ ہوں۔ انبیاءؑ اور صحابہؓ کا ذکر جہاں آیا ہے وہاں علیہ السلام یا رضی اللہ عنہا، ضمیر واحد مذکر یا واحد مؤنث لکھنا موخر الذکر مثالیں زیادہ ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۵۷، ۹۱ اور ۱۱۸ صفحات ۴۲ اور ۵۸ پر صحیح استعمال کی مثالیں بھی ہیں۔ ص۵۲ پر فتاویٰ کبیر کی عبارت اور ص۵۳ پر حضرت علیؓ کے قول کو بھی حدیث شمار کیا گیا ہے۔ یہ غلط فہمی ان کے دئے ہوئے نمبروں سے ہوتی ہے غالباً اسی کمی کا نتیجہ ہے کہ جہاں جہاں آیتوں یا عربی عبارتوں کے ترجمے خود سے کئے گئے ہیں وہاں غلطی راہ پاگئی ہے۔ مثال کے طور پر ص۱۲ پر درج عربی عبارت کے لفظ الینا کا ترجمہ نہیں ہوسکا ہے ص۱۷ نَزَّلَ بہ کا ترجمہ نازل کیا صحیح نہیں ہے۔ نازل کرنے کے لیے انزل یا نَزَّل آتے ہیں نزل کے معنی اترنے کے ہیں۔ ص۱۶ پر یوی کا ترجمہ 'نازل کرے' صحیح نہیں ہے۔ ص۵۲ پر تیسری حدیث کے ترجمے کا یہی حال ہے۔ ص۷۳ پر درج روایت کے آخری الفاظ کا ترجمہ نہیں ہوسکا ہے۔ ص۱۱۴ پر جس آیت کا ترجمہ ہے اس میں تشریحی اضافہ قوسین میں ہونا چاہیے۔ ص۱۲۴ پر آیت نمبر ۳ اور ۵ کا ترجمہ صریحاً غلط ہے۔ نویں نمبر کے الفاظ فی الرقاب کا ترجمہ موجود نہیں ہے۔ پڑھنے والا اس کا ترجمہ بھی فرزندان راہ ہی سمجھے گا۔ یاتیک الیقین کا ترجمہ ناقص ہے۔ ص۱۵۶ پر آیت نمبر ۵ اور ۶ کے ترجمے محل نظر ہیں ص۱۵۷ پر آیت نمبر ۱۳-۱۴-۱۵، توجہ چاہتے ہیں۔ ص۱۷۱ پر عربی عبارت کا ترجمہ نظر ثانی چاہتا ہے۔ ص۱۷۴ پر درج آیتوں کے ترجمے بھی توجہ چاہتے ہیں، ص۱۸۳ پر انفس کا ترجمہ انفاس کیا گیا ہے۔ ص۱۸۶ کی پہلی آیت کا ترجمہ۔ اور ص۲۰۰ پر پہلی آیت کا ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ ایک ہی آیت کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے۔ ص۲۲۳ والا ترجمہ صحت سے زیادہ قریب ہے جبکہ ص۱۴ پر کیا گیا ترجمہ محل نظر ہے۔ ص۲۲۴ پر آیت کا ترجمہ خلاف احتیاط ہے۔ ص۲۲۸ پر درج پہلی آیت کا ترجمہ کئی پہلوؤں سے محل نظر ہے۔ ص۲۴۷ پر پہلی آیت کا ترجمہ غیر محتاط ہے۔ ص۲۵۷ پر درج پہلی آیت کا ترجمہ ناقص ہے۔

ص۱۰۳ پر نوٹ ڈیکے کی تصنیف کے سلسلہ میں درج سنین میں غلطی راہ پاگئی ہے، اسی طرح ص۲۵ پر لفظ "لیکن" غلط فہمی پیدا کرتا ہے ورنہ زرقانی کی مثال غلط دی گئی ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے مباحث کا معاملہ ہے تو مرتب نے بہت سلیقے سے بیش قیمت معلومات اس میں جمع کردی ہیں۔ بعض مباحث میں اپنا نقطۂ نظر یا ترجیحی

رائے کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر محکمات و متشابہات کے مفاہیم کے تعین میں انھوں نے تقریباً تمام رایوں کا احاطہ کرنے کے بعد ایک رائے کو ترجیح دی ہے۔ دیگر مباحث میں بھی ان کا یہ طریقہ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے خیال کو راجح سمجھا جائے یا مرجوح ابتدائی مبحث میں انھوں نے اجزاء قرآن پر بحث کرتے ہوئے اپنی ایک تقسیم بھی درج کی ہے لیکن اس کے اگلے ہی صفحہ پر شاہ ولی اللہ صاحب کی تقسیم کو سب سے جامع قرار دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سب سے جامع تقسیم موجود ہے تو پھر ایک نئی تقسیم کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب موجود نہیں ہے۔ مزید براں مرتب کی تقسیم پر غور کرنے سے چند واضح کمیاں محسوس ہوتی ہیں مثال کے طور پر فقہ و احکام دین اور اوامر و نواہی کو الگ الگ کیا گیا ہے حالانکہ وہ اوامر و نواہی کی شق کے تحت یا احکام دین کے تحت آسکتی ہیں۔ آخرت کے ضمن میں نافرمانوں کو ملنے والی سزا کا جو ذکر ہے وہ قصص کے ذیل میں آسکتا ہے اور آخرت کا ذکر "اعتقادات" کے ذیل میں۔

کتاب کے بعض مباحث غلط فہمی پیدا کرنے والے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر وحی کی بحث کہ رسول اکرمؐ پر معانی کا نزول ہوتا تھا پھر آپ مناسب لفظوں کا جامہ پہنا کر اسے پیش کرتے تھے ص۱۴ اگرچہ یہ بھی صراحت ہے کہ موخر الذکر کام وحی الٰہی کے موجب انجام پاتا تھا۔ مگر غلط فہمی کا امکان پھر بھی باقی رہتا ہے کہ الفاظ قرآن کہیں خود رسول اکرم کے تو نہیں ہیں۔ اس کتاب کے ہر مبحث میں مختلف النوع آراء نقل کرتے ہوئے مصنف نے قرآن مجید کی اصل حیثیت مجروح نہیں ہونے دی ہے بلکہ وہ عام طور پر متوازن اور معتدل نقطۂ نظر کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں، وہ قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریف سے مبرا سمجھتے ہیں جیسا کہ انھوں نے متعدد مقامات پر بالخصوص کتب مقدسہ کے ذکر میں قرآن مجید اور تحریف جیسے نازک موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے۔ کتاب کا ایک دلچسپ پہلو معلومات کی کثرت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید سے متعلق لطائف وغیرہ کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کے حروف مقطعات سے مختلف اوقات میں کیا با معنی جملے وضع کیے گئے صفحات ۲۲۶، ۲۲۷۔ قرآن مجید کے جواب میں آیات گھڑنے کی مضحکہ خیز کوششیں۔ قرآن مجید کے خلاف معاندانہ رویے صفحات ۲۱۰ تا ۲۱۴، قرآن کے عجمی الفاظ کا منظوم بیرایہ ص۱۴۳ کتابت کی بے شمار غلطیوں

BAYAZ AHMED SHERIFF
85/9, MARAPPA THOTA,
M. K. PALYAM, BANGALORE

کے ماسوا ایک لفظ جس کے استعمال میں مصنف منفرد ہیں وہ ہے سورۃ کی جمع سوروں حالانکہ اب تک تمام اردو داں اسے سورتوں استعمال کرتے آئے ہیں اس کتاب میں بھی غلطی سے ایک مقام پر سورتوں لکھ گیا ہے ص۹۱ ۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اس کا عمومی استعمال ہی صحیح ہے۔ علم تفسیر اور علم تفہیم کی الگ الگ تقسیم غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ علم تفہیم کے ضمن میں مصنف نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے عربی دانی ضروری نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ قرآن مجید کی زبان کو سمجھے بغیر آدمی اس کے بیان کردہ مفہوم کو سمجھ سکتا ہے اس سے ہدایت حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ اور تفسیر سے استفادہ کا عمل ہوا اصل عبارت سے استفادہ کا عمل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی جانے بغیر کسی شخص کو اس کی تفہیم کا معتبر مجاز نہیں سمجھا جاسکتا اور ایسے لوگوں کی علوم قرآنی پر تصنیفات جو عربی زبان سے ناواقف ہوں درجہ استناد حاصل نہیں کرسکتیں یہی وجہ ہے کہ جتنے اہل علم نے قرآن مجید پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے پہلے اس کی اصل زبان سے واقفیت حاصل کی ہے خود مصنف کتاب کو بھی یہ معلوم ہے کہ مستشرقین نے بھی عموماً قرآن مجید پر لکھنے سے قبل اس کی زبان بہت اہتمام سے سیکھی ہے۔

اس کتاب میں عام طور پر علماء محققین، مفسرین اور اہل لغت وغیرہ کے اقتباسات تو ہیں مگر علمی کتابوں کی طرح ان کتب کے حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نظم قرآن کی بحث میں لکھا گیا ہے کہ مفسرین نے اس کی نشاندہی کی ہے کہ سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کی ہدایت مانگی گئی ہے اس کا جواب پورا قرآن مجید ہے۔ لیکن کسی مفسر کا حوالہ نہیں ہے اس طرح تمام سورتوں کے ذکر کا معاملہ ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں اس پہلو پر ماضی قریب میں علامہ حمید الدین فراہیؒ نے بہت زور دیا ہے اور پھر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے انہی کے بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے "تدبر قرآن" جیسی تفسیر لکھی لیکن ان علماء کا کوئی حوالہ اس پوری کتاب میں نہیں ہے۔

کتاب کے آخر میں چھ ضمیمے ہیں جو بالترتیب کاتبان وحی اور ترتیب نزول کی فہرست، لغات القرآن کی فہرست قرآن مجید کے عجمی الفاظ، قرآن مجید اور علامات اور حروف مقطعات پر ڈاکٹر ہاشم امیر علی کی رائے کے اقتباس پر مشتمل ہیں۔ اس کی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود تبصرہ نگار کی نظر میں اردو زبان میں قرآن مجید سے متعلق اس قدر متنوع مباحث پر شائع ہونے والی یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ (منور حسین فلاحی)